



PDFBOOKSFREE.PK

www.pdfbooksfree.pk

نسیم چاری

مُعَظَّم عَلٰی

www.pdfbooksfree.pk

نہیم ججاری



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

فرحین پبلشنگ کمپنی F3 کھجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



## پہلا باب

معظم علی مرشد آباد کے قید خانے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاٹی کی داستان اُن اُمیدوں، آرزوں، حوصلوں اور دلولوں کی داستان تھی جو پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ زندگی کے دامن میں اب اُس کے لیے مہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ پہلے بھی مرشد آباد سے کوسوں دور ایک قید خانے میں رہ چکا تھا۔ لیکن وہاں اپنی تاریک کوٹھری میں وہ اس مرشد آباد کا تصور کر سکتا تھا جس کا ہر گوشہ قس قس کی انگلیوں سے لبریز تھا۔ حال کی تمنیاں اُسے مستقبل کی مسترتوں کا پیغام دے سکتی تھیں۔ اسیری کی رات کے تاریک پرے اٹھا کر وہ صبح آزادی کے آفتاب کی سنہری کرنیں دیکھ سکتا تھا۔ اڑلیہ کی سرحد کے پار وہ قید خانہ اعلیٰ کے راستے کی ایک منزل تھی اور اسے یقین تھا کہ کسی دن وہ اس منزل سے گزر کر وہ پھر اس دنیا میں پہنچ جائے گا، جہاں زندگی کی سکراہٹیں اس کے استقبال کے لیے موج دے رہی ہیں لیکن مرشد آباد میں اس کی اسیری کا زمانہ ان ستاروں کی جھلکاہٹ سے محروم تھا جو تاریک رات کے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں۔

کوٹھری کی دیوار میں چھت کے قریب ایک تھوڑا سا روزن تھا اور قید کے ابتدائی ایام میں اس روزن سے سورج کی شعاعیں اسے دنیا کا پیغام دیا کرتی تھیں جہاں ابھی تک اُمید کا ایک چراغ منور رہا تھا۔ وہ تصور میں اپنے ماحول کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر اس مکان

نام کتاب \_\_\_\_\_ معظم علی

مصنف \_\_\_\_\_ نسیم حجازی

ناشر \_\_\_\_\_ فرحین پبلشنگ کمپنی

۳ F کجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار

مطبع \_\_\_\_\_ فرح انسیٹ پرنٹرس دہلی

سال اشاعت \_\_\_\_\_ فروری ۱۹۹۶ء

قیمت \_\_\_\_\_ ساٹھ روپے / 60/- Rs.

فرحین پبلشنگ کمپنی ۳ F کجوری روڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نویسنہ

سول ایجنٹ

ادبی دنیا ۱۰ مئی محل دہلی ۱۱۰۰۰۶

کی چار دیواری میں جا پہنچتا جو اس کی مہم اُمیدوں کی آخری جلتے پناہ تھا۔ وہ اُن کمروں کا طواف کرتا جہاں کبھی مسرت کے قہقہے گونجتے تھے۔ اچانک فرحت مکان کے کسی گوشے سے نمودار ہوئی اور وہ کہتا "فرحت! فرحت!! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں، میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ قید خانے کی تنہائیوں میں تم ہر وقت میرے ساتھ تھیں۔ میرے پسے اور آندڑیوں سب تمہارے لیے تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں جا چکی ہو اور میں تمام عمر تمیں تلاش کرتا رہوں گا۔ کاش ا قید خانے میں مجھے تمہارا کوئی پیغام مل سکتا۔! فرحت! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم مُرشد آباد سے کہیں دور نکل جائیں گے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں کبھی یہ محسوس نہیں کروں گا کہ میں کاروانِ حیات کا ایک لٹا ہوا مسافر ہوں۔" پھر اس کی کوٹھڑی میں اور قیدی آئے اور انھوں نے بتایا کہ فرحت اور اس کے والدین تمہاری گرفتاری کے اگلے دن مُرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے۔

اس کے بعد معظم علی کو مستقبل کے متعلق مہم اُمیدیں مایوسیوں سے زیادہ کرب انگیز محسوس ہوتی تھیں۔ وہ فرحت کو ان دیکھے صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کسی دور افتادہ بستی کی جھونپڑی میں دیکھتا اور کبھی وہ اسے کسی پر رونق شہر کے محل میں نظر آتی تھی۔ پھر اس شہابِ ثقب کی طرح جو ایک ثانیہ کے لیے تاریک فضا میں نور کے خزلے بکھیرنے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے۔ فرحت کی دلکش تصویریں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور وہ حال اور مستقبل کے بھیانک غلام سے نکل کر ماضی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا۔ کبھی تصور اسے اس مکان میں لے جاتا جہاں اس نے زندگی کی ابتدائی سکراہٹیں دیکھی تھیں۔ کبھی وہ اس غلے کی گلیوں میں گھومتا جہاں وہ اپنے بچپن کے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ سنِ شعور سے لے کر قید خانے میں پہنچنے تک کی زندگی اسے ایک خواب معلوم ہوتی تھی۔ ایک ایسا خواب جو دلکش بھی تھا اور بھیانک بھی :-

مظلم علی اس قوم کا فرد تھا جو صدیوں تک اس ملک میں اپنی سطوت و اقبال کے چیم لہانے کے بعد زوال کے آخری مرحلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اس دقت آنکھ کھولی تھی جب مغلوں کی عظیم اُشان سلطنت لامرکزیت اور انتشار کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر ہندوستان کا وہ دفاعی حصار پر پوز زمین ہو چکا تھا جسے تیمور کے جانشینوں نے تعمیر کیا تھا۔ دل کے تحت پر قبضہ کرنے کے لیے حریص قسمت اکرمادوں کے لشکر موجود تھے۔ ملک کی سیاست ہر ضابطہ اخلاق سے آزاد تھی۔ نام نہاد بادشاہ اپنے وزیروں، اہلکاروں اور بعض اوقات خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں شطرنج کے مہرے تھے۔ طالع آدمیوں کی تواریں کبھی تاج پہننے والوں کے سر قلم کرتی تھیں اور کبھی تاج پہنانے والوں کے خون میں نہاتی تھیں۔ اقتدار کی مسند تک پہنچنے کے لیے ایک قسمت آزمائی لاش دوسرے قسمت آزمائے کے لیے زینے کا کام دیتی تھی، عمد لکھنی، عیاری، فریب، سازش اور قتل لال قلعے کی دیواروں میں جنم لینے والی داستانوں کے مستقل عنوان بن چکے تھے۔ لال قلعے سے باہر ہر صوبیدار اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں تھا۔

مرکز اور صوبوں میں علاقائی سیاست کا یہ دور المناک بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ بادشاہ مسکات کبھی کسی امیر کی تلوار سے مغرب جو کر اور کبھی اس کی خوشامد سے خوش ہو کر اسے کسی علاقے کی صوبیداری کی سند عطا فرماتے۔ وہ صوبائی دارالحکومت کی طرف روانہ ہوتا تو اسے رستے میں یہ خبر ملتی کہ شہنشاہ والا تبار نے اپنا پہلا حکم نامہ منسوخ فرما کر کسی اور کو صوبیداری کی سند عطا کر دی ہے اور وہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت صوبائی دارالحکومت کا رخ کر رہا ہے۔

پھر صوبے کے اُمراء کا ایک گروہ پہلے امیدوار کے ساتھ اور ایک دوسرا گروہ دوسرے امیدوار کے ساتھ مل جاتا۔ دونوں میں جنگ ہوتی۔ ہارنے والا امیدوار اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور اس کا خون جھپٹنے والے کی سند پر مُر تصدیق ثبت کر دیتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ صوبیدار کا ایک امیدوار شاہی فرمان کے عوض ایک معقول رقم پیش کرتا اور دوسرا امیدوار اس سے زیادہ



رقم دے کر اپنے لیے ایک اور فرمان حاصل کر لیتا۔

۱۷۵۷ء میں سلطنتِ دہلی کے ایک ہوشیار وزیر نظام الملک آصف جاہ نے اپنی نظر اچالوں کی بدولت دکن میں مضبوطی سے قدم جمایے۔ وہ بظاہر دلی کے نام نہاد بادشاہ کا صوبیدار تھا لیکن عملاً دکن کے سیاہ و سفید کا مالک بن چکا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کے اسلاف، سلطنتِ خوارزم پر تاتاریوں کے حملوں کے زمانہ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور خاندان ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں اسی خاندان کا ایک فرد محمد جان جہاں انور الدین حکومت کا ادنیٰ ملازم تھا۔ لیکن اورنگ زیب کی موت کے بعد جب ہر قسمت آزما کے لیے ترقی کے راستے کھلے تھے۔ یہی جان جہاں، خان جہاں بن گیا اور کرناٹک کی نظمیت پر فائز ہوا۔ ۱۷۵۹ء میں انور الدین خان جہاں نے وفات پائی اور کرناٹک کی حکومت اُس کے بیٹے محمد علی والا جاہ کے ہاتھ میں آئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر فرنگی تاجروں کی بستیاں سلجھناؤں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ایک طویل کشمکش کے بعد انگریز اور فرانسیسی تاجر اپنے پر تگالی اور ولندیزی حریفوں کو مات دے چکے تھے اور اب وہ ہندوستان کی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کا بجائے اس ملک کے سیاسی اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے اندرونی خلفشار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کسی صوبہ میں حکومت کے دعوے داروں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو ایک فریق انگریزوں کی حمایت حاصل کرتا اور دوسرا فریق اپنا مستقبل فرانسیسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول کے جانشین کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کھلتے رہے۔ کرناٹک میں محمد علی والا جاہ انگریزوں کی بساط سیاست کا ایک مرہ تھا

اور فرانسیسی، کرناٹک کی حکومت کے ایک اور دعوے دار چندا صاحب کے طرف دار بن گئے تھے۔ چندا صاحب نے کرناٹک کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر کے محمد علی کو ترجیح ملی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چند سال تک محمد علی ایسا حکمران تھا جس کے قبضے میں کوئی ملک نہ تھا اور جس کی رعایا زیادہ تر اپنے خاندان کے افراد، چند نوکروں، جی حنفیوں اور خوشامدوں تک محدود تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ انگریزوں کی سنگینوں کے پہرے میں باقاعدہ دربار لگاتا تھا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے تھے اور اسے نواب والا جاہ، امیر السند، عمدة الملک، آصف الدولہ محمد علی خاں، بہادر ظفر جگ، سپہ سالار، صاحب السیف و القلم، تدبر امرائے عالم، فرزند عزیز ارجان کے القاب و خطابات سے پکارا جاتا تھا۔ جب انگریز، فرانسیسیوں سے کرناٹک کا کوئی علاقہ فتح کرنے تو یہ سپہ سالار اپنی حرم سرا میں جشن مناتا اور جب انھیں اپنی افواج کو تڑواہ دینے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی تو اس تدبر امرار عالم کو مغلوں، الحال عوام سے ٹیکس وصول کرنے کے کام پر لگا دیا جاتا۔

پہلے چندا صاحب نے فرانسیسیوں کی خدمات کے صلے میں کرناٹک کے بعض علاقے ان کے حوالے کر دیئے۔ پھر جب محمد علی کی باری آئی تو اس نے انگریزوں کو عملاً کرناٹک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ بظاہر کرناٹک محمد علی کی شکار گاہ تھا لیکن شکار کھیلنے والے انگریز تھے۔

دلی کے تخت کے ساتھ نوابانِ اودھ کا تعلق بھی برائے نام تھا۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت پر ملی درودی خاں نے قبضہ جمایا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی طرح بنگال میں بھی انگریز تاجر اپنے قدم جما چکے تھے۔ لیکن ملی درودی خاں ایک بیلہ مغز اور دراندیش حکمران تھا۔ اور اس نے فرنگی تاجروں کو جو مراعات دیں ان کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنی تجارتی بستیوں میں قلعے یا دفاعی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور بڑی طاقت مرہٹے تھے جو مغلیہ سلطنت کے کشنوں پر اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی فکر میں تھے۔

معظم علی نے اس وقت آنکھ کھولی تھی جب ہندوستان مرہٹہ لیڈوں کے لیے ایک وسیع لشکار گاہ بن چکا تھا۔ اس کا باپ محمود علی، علی دودی خان کی محافظ فوج میں پانچ سو سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد کے شہرے باہر ایک نئے محلے میں محمود علی کے مکان کے سامنے ایک بہت بڑے جاگیردار مرزا حسین بیگ کا قلعہ نمائے تھا۔ جس کی چار دیواری کے اندر رہائشی مکان کے علاوہ گھوڑوں کے اصطبل اور نوکروں اور پیرے داروں کے کمرے تھے۔ معظم علی کا باپ ایک فوجی افسر ہونے کے باوجود مرزا حسین بیگ کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ ابتداء میں ان کے تعلقات محض رسمی تھے۔ لیکن ان کے بیٹوں کی دوستی آہستہ آہستہ انھیں بھی ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ حسین بیگ کا چھوٹا بیٹا افضل بیگ، معظم علی سے دو سال بڑا تھا۔ اور بڑا جس کا نام آصف بیگ تھا، معظم علی کے بڑے بھائی یوسف علی کا ہم عمر تھا۔ بچپن میں یوسف اور معظم علی کے دوسرے بچوں کی طرح حویلی میں چلے جاتے اور دن بھر آصف بیگ اور افضل کے ساتھ کھیلتے رہتے۔

حویلی میں ایک سنہری بابوں والی کم سن لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، اور معظم علی کو اس کے معصوم قمقمے بہت پسند تھے۔ یہ لڑکی افضل کی چھوٹی بہن تھی اور اس کا نام فرحت تھا۔

محمود علی اور اس کی بیوی کو حسین بیگ کے خاندان کے مقابلے میں اپنی کمتری کا احساس قلعہ تاہم انھیں یہ گوارہ تھا کہ ان کے بچے کسی کے مقابلے میں حقیر سمجھے جائیں۔ چنانچہ ان کی ہمیشہ یہ گوشش ہوتی کہ ان کے بچوں کا لباس اگر حسین بیگ کے بچوں کی طرح قیمتی نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا ضرور ہو۔ پھر جب آصف اور افضل مرشد آباد کے بہترین مکتب میں داخل ہوئے تو محمود علی نے یوسف اور معظم کو بھی اسی مکتب میں داخل کر دیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ افضل اور آصف بھی پر سوار ہو کر جاتے تھے اور یوسف اور معظم کو پیدل جانا پڑتا تھا۔ پھر جب یہ بچے آپس میں بہت

زیادہ گھل جاتے تو آصف اور افضل اصرار کر کے معظم اور اس کے بھائی کو اپنی گنجی پر بٹھالیتے۔ گھر پر حسین بیگ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک معقول تنخواہ پانے والا تالیق مقرر تھا اور معظم اور یوسف کا باپ فرصت کے اوقات میں خود ہی انھیں پڑھا دیا کرتا تھا۔

امراء کے بچوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب آصف اور افضل ذرا بڑے ہوئے تو حسین بیگ نے ان کی فوجی تربیت کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ انھیں شمشوری، تیراندازی اور نیزہ بازی سکھایا کرتا تھا۔ لیکن محمود علی نے اس کام کے لیے کسی اور کی خدمات کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مرشد آباد میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو گھوڑے کی سواری اور توار، نیزہ اور بندوق کے کھیلوں میں اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

اس کے گھر میں ایرانی قائلین نہ تھے لیکن اس کے اصطبل میں عربی نسل کے تین چار گھوڑے ضرور موجود رہتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے وہ اپنے ذاتی اسلحہ خانے کی بہترین تواروں اور بندوقوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی مصروف زندگی سے بچوں کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتا اور انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے شہرے باہر کسی کھلے میدان میں لے جاتا۔



مرزا حسین بیگ کے کتب خانہ میں سینکڑوں کتابیں تھیں اور یہ کتابیں اس نے پڑھنے کا شوق پورا کرنے سے زیادہ اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے جمع کر رکھی تھیں۔ معظم کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی افضل بیگ سے کتابیں مانگ لایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اس کے گھر گیا اور افضل اور آصف دیوان خانہ کے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنے عمر رسیدہ تالیق سے سبق لے رہے تھے۔ ان کی توجہ کتابوں کی طرف تھی۔ معظم علی کچھ دیر تذبذب کی حالت میں چند قدم دور کھڑا ہوا۔ اچانک تالیق نے اس کی طرف دیکھا اور کہا: ”بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں یہ پڑھ رہے ہیں۔ بھاگ جاؤ!“



یہ بات معظم علی کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ چند گنیے یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے  
افضل بیگ نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے آتاق سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ کتابیں لینے آیا ہے  
مجھے اجازت دیجئے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

آتاق جس قدر کھینے والے لڑکوں کو ناپسند کرتا تھا اسی قدر اسے پڑھنے والوں سے دلچسپی  
تھی۔ اُس نے دوبارہ معظم کی طرف دیکھا اور افضل سے کہا: "اچھا جاؤ لیکن جلدی آنا!"  
افضل بیگ اٹھ کر معظم علی کے ساتھ چل دیا۔ دیوان خانے کے چند کمرلوں کے طویل  
برآمدے سے گزرنے کے بعد وہ کونے کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کا ایک  
دروازہ رہائشی مکان کے صحن کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں ساگوں کی خوبصورت الماریاں  
کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ افضل بیگ نے کہا: "تم اطمینان سے اپنے لیے کتابیں نکالو  
میں استاد کے پاس جاتا ہوں۔"

افضل بیگ بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ معظم علی اس کمرے میں کئی بار پہلے بھی آچکا  
تھا۔ اسے اپنے مطلب کی کتابیں نکالنے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دو  
عربی اور تین فارسی کی کتابیں لے کر باہر چل دیا۔ واپسی پر وہ افضل اور آصف کے قریب سے  
گزرا تو آتاق نے اسے دیکھتے ہی آواز دی: "میاں صاحبزادے ذرا ادھر آؤ!" معظم جھکتا ہوا  
ممر رسیدہ آتاق کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آتاق نے کہا: "دکھاؤ کون سی کتابیں پڑھتے ہو تم؟"  
معمظم نے کتابیں آگے بڑھادیں۔ آتاق نے یکے بعد دیگرے تمام کتابیں کھول کر دیکھیں اور  
تدرے حیران ہو کر کہا: "تم یہ کتابیں پڑھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم انہیں سمجھ بھی سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا ہم تمہارا امتحان لیتے ہیں: یہ کہ عربی کی ایک کتاب اٹھا کر کھولی اور

معمظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اچھا یہ پڑھ کر سناؤ!"  
معمظم نے اطمینان سے چند سطریں پڑھ کر سنا دیں تو آتاق نے ترجمہ کرنے کے لیے کہا: معظم  
نے کسی جھجک کے بغیر ترجمہ سنا دیا تو آتاق نے سوال کیا: "تم کمال تعلیم پاتے ہو؟"  
"جی میں افضل کے ساتھ پڑھتا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"جی اسی محلہ میں اس مکان کے بالکل سامنے۔"

"تم.... تم عمود علی خان کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

آتاق کچھ کنا چاہتا تھا کہ چچے سے کسی کی آواز سنا دی۔ یہ کون ہے؟

"آتاق نے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔"

"آپ تشریف رکھیے؟ مرزا حسین بیگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: "اور یہ شاید عمود علی کا  
لڑکا ہے؟"

"جی ہاں میں ابھی اس سے متعارف ہوا ہوں بہت ہو سارہ کچھ ہے۔ دیکھیے یہ آپ

کے کتب خانہ سے صبح فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ کتابیں اس عمر کے بچوں کے لیے بہت مشکل ہیں۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں صاحبزادوں کے ساتھ اسے بھی پڑھا دیا کروں؟"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے عزیز لڑکے معنی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آصف اور

افضل کے لیے ایسے لڑکے کی رفاقت اچھی رہے گی۔ یہ کہ کہ حسین بیگ معظم علی کی طرف متوجہ

ہوؤ۔ برخوردار تم مکتب سے چوٹی کے بعد میاں آجایا کرو۔ میں عمود علی سے بھی کہہ دوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔" معظم علی نے تشکر کے ساتھ نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

آصف نے کہا: "ابا جان معظم کا بڑا بھائی یوسف علی میرا ہم جماعت ہے اگر آپ کی اجازت

ہو تو وہ بھی میاں آجایا کرے؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "اگر تمہارے استاد کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔"

اتاقیق نے کہا: "جی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اندرونی چار دیواری کے پھاٹک سے ایک نوکر نمودار ہوا اور اس نے حسین بیگ کو سلام کرنے کے بعد اتاقیق کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "جناب شیرعلی خاں صاحب پوچھتے ہیں کہ صاحبزادہ کب فارغ ہوں گے؟"

اتاقیق نے جواب دیا: "بس میں آج کا کام ختم کر چکا ہوں، یہ جاسکتے ہیں۔"

آصف اور افضل اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

افضل نے کہا: "معظم آؤ تم بھی، ہم آج کل پستول پلانے کی مشق کر رہے ہیں۔"

بھگتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

حسین بیگ نے اتاقیق سے کہا: "چلیے آج آپ بھی اپنے شاگردوں کا نشانہ دیکھیے۔"



اتاقیق کا نام بابا القدوس تھا اور اس کا شمار مرشد آباد کے چند چپیہ علماء میں ہوتا تھا وہ حسین بیگ کے ساتھ باتیں کرتا ہوا محل کی اندرونی چار دیواری سے نکل کر بیرونی احاطے میں داخل ہوا تو وہاں پھاٹک سے چند قدم دور دیوار کے ساتھ ایک برآمدے میں بچوں کا فوجی استاد دکھائی دیا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی آگے بڑھا۔ حسین بیگ نے کہا: "ہم آپ کے شاگردوں کا نشانہ دیکھنے آئے ہیں۔"

شیرعلی نے کہا: "یہ میری خوش قسمتی ہے اور مجھے امید ہے کہ میرے شاگرد آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ چلیے!"

حسین بیگ نے کہا: "شیرعلی! یہ معمولی کامیاب ہے۔ مولوی صاحب نے آج زبردستی اسے اپنا شاگرد بنالیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس کا امتحان لیں۔"

شیرعلی نے جواب دیا: "جناب اس کا امتحان لینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے باہر مین

میں گھوڑا بھگاتے اور نشانہ بازی کرتے دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد نوکروں اور پیڑیوں کی کوٹھڑیوں کے قریب سچ کرڑکے۔ باہر کی فصیل کے قریب ایک درخت کے نیچے چند سپاہی جمع تھے۔ اور ایک میز پر چار پستول رکھے ہوئے تھے۔ سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی شاخ کے ساتھ ایک تختی لٹک رہی تھی جس کے درمیان پان کی شکل کا ایک سرخ نشان بنا ہوا تھا۔ سپاہی حسین بیگ کو دیکھ کر ادب سے ادھر ادھر بٹ گئے اور شیرعلی کے اشارے پر آصف نے پستول چلا دیا۔ نشانہ سرخ نشان کے نیچے کنارے پر لگا۔ اس کے بعد افضل کی باری آئی اور اس کی گولی سرخ نشان سے کوئی دو اینچ باہر لگی۔ تاہم اس کی عمر کے لحاظ سے یہ بھی ایک کارنامہ تھا اور بوڑھا استاد مرزا حسین بیگ کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا اب دوبارہ کوشش کرو! اس نے کہا۔"

بچوں نے خالی پستول میز پر رکھ دیئے اور بھرے ہوئے پستول اٹھالیے۔ افضل کی دہری کوشش قدرے بہتر تھی لیکن آصف کا ہاتھ ہل گیا اور اس کی گولی تختی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ دو سپاہی میز کے قریب کھڑے پستول بھرنے میں مصروف تھے۔ آصف نے اپنی کھسیا ہٹ چھپانے کے لیے جلدی سے خالی پستول میز پر رکھا اور بھرا ہوا پستول اٹھالیا۔ اب اس کی گولی نشانہ پر لگی۔ افضل کی باری آئی تو وہ بھرا ہوا پستول اٹھا کر خود نشانہ لگانے کی بجائے معظّم علی کی طرف بڑھا اور بولا: "اب تمہاری باری ہے۔"

معظّم نے قدرے توقف کے بعد اپنی کتابیں ایک سپاہی کے ہاتھ میں دے دیں اور افضل کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

حسین بیگ نے کہا: "میاں صاحبزادے دیکھنا کسی آدمی کو زخمی نہ کر دینا!"

افضل نے کہا: "جی آپ فکرو کریں اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

معظّم آگے بڑھا۔ اس نے نشان کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک پستول دالا ہاتھ اوپر اٹھایا اور



آٹھ بجے کی دیر میں بلبی دبا دی۔ دیکھنے والے سرخ نشان کے عین وسط میں ایک سوراخ دیکھ رہے تھے۔

مظلم علی نے خالی پستول میز پر رکھ دیا اور سپاہی کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حسین بیگ نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "شاباش! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"جی میرے بھائی کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے۔"

حسین بیگ نے میز سے ایک پستول اٹھایا اور مظلم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا تم انعام کے حقدار ہو۔ یہ لوادر دیکھو۔ جب تم بڑے ہو کر جنگ کے میدان سے سرخرو ہو کر آؤ گے تو میں تمہیں اپنے اسلحہ خانے کی بہترین بندوق اور اپنے اہلکے کے بہترین گھوڑے کا حقدار سمجھوں گا۔



اس واقعہ کے تین دن بعد حسین بیگ کے ہاں مرشد آیا دے چند امر کی دعوت تھی اور محمود علی کو پہلی بار اس کے دسترخوان پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک ہفتہ بعد حسین بیگ کی بیوی نے شہر کی چند معزز خواتین کو دعوت دی اور اس نے مظلم علی کی ماں آمنہ کو بھی مدعو کیا۔ حسین بیگ کی بیوی بظاہر آمنہ کے ساتھ تپاک سے پیش آئی لیکن اپنے جلتے کی اکثر خواتین نے اس کے ساتھ بے تکلف ہونا پسند نہ کیا اور اپنی میزبان کے ظاہری خلوص کے باوجود آمنہ پر بات محسوس کیے بغیر نہ سکی کہ کمن بچوں کی دوستی اور ان کے دعوتیں اور ملاقاتیں اس خلیج کو نہیں پاٹ سکتیں جو ان کے درمیان حائل ہے۔ فرحت کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ امر لڑکی چند لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ اس دعوت میں شریک تھیں اسے اپنی طرف توجہ کرنے میں ایک دوسری سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں اس کی شکل و صورت اور اس کے لباس سے متاثر تھیں اور وہ کسی کو "خالہ جان سلام" اور کسی کو "چچی جان سلام" کہہ کر باری باری سب سے دعائیں لے رہی تھیں۔ آمنہ کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اس کی

طرف بار بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی لیکن فرحت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ایک بار اس کی ماں نے کہا: "فرحت! بیٹی تم نے اپنی خالہ کو سلام نہیں کیا اور فرحت نے بے توجہی سے آمنہ کی طرف دیکھا اور شکمہ جانی سلام کہہ کر ایک خوش پوش میرزاؤی کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تاہم آمنہ کے دل سے اس کے لیے ہزلوں و عائن لک رہی تھیں لیکن کاش یہ شوخ اور عین لڑکی جسے آمنہ نے پہلی نظر میں ہی اپنی بیٹی سمجھ لیا تھا اسکی دعائیں سن سکتی۔ کاش وہ اپنے جلتے کی دوسری خواتین کی طرح اسے اپنے پاس بٹھا سکتی اس کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی۔ اس کے سنہری بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سنوار سکتی وہ دُور ہی دُور سے اُن شوخ آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن میں ہمالیہ کے دان کی جھیلوں کی دکھائی اور گرائی نظر نظر آتی تھی وہ اس کے خوبصورت دانت دیکھ رہی تھی جو ہنسنے وقت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ دعوت کے اختتام پر وہ اپنے دل میں یہ احساس لے کر نکلی کہ حسین بیگ کی بیوی اور اس کے درمیان محبت کی دیوار بدستور کھڑی ہے۔

لیکن یہ دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ یوسف اور مظلم کے ساتھ افضل اور آصف کی بے تکلفی بڑھتی گئی۔ پہلے جب وہ مدرسے جانے کے لیے گھر پر سولہ ہو کر گھر سے نکلتے تھے تو مظلم اور یوسف ڈیڑھ گھنٹہ کے سامنے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ اب اگر انھیں کبھی دیر ہو جاتی تو آصف اور افضل اپنی گھمبھی ان کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے انھیں بلا لیتے۔ گھر میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی باتیں ایک دوسرے کے متعلق ہوتیں۔ ہم آج فلاں جگہ سیر کیے گئے تھے۔ آج ہماری فلاں محلے کے لڑکوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ ہم صرف چار تھے اور ہم نے اتنے لڑکوں کو مار بھجایا تھا۔ آج پیر کی میں ہمارا مقابلہ ہوا تھا اور فلاں سب سے آگے نکل گیا تھا۔ آج فلاں نشانہ بازی اور فلاں نیزہ بازی میں اول آیا تھا۔ حسین بیگ کے گھر میں افضل ہمیشہ مظلم علی کی اور آصف ہمیشہ یوسف کی کسی نہ کسی خوبی کی تعریف کرتا۔ اسی طرح جب مظلم اور یوسف سونے سے پہلے اپنے والدین کو دن بھر کے واقعات سناتے تو مظلم کی زبان پر بار بار افضل کا نام آتا اور یوسف کی زیادہ باتیں عام طور پر آصف کے متعلق ہوتیں۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب آمنہ دوسری بار حسین بیگ کے ہاں گئی تو افضل کی ماں اس کے ساتھ اتھائی بے تکلفی سے پیش آئی۔

وہ ایک دوسری کو اپنے پہنے بیٹوں کے بچن کے واقعات سن رہی تھیں اور فرحت گری لچپی کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی آمنہ معظمہ یا یوسف کی کسی شراوت کا ذکر کرتی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں۔



وقت گزرتا گیا۔ بڑپکن سے جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھے۔ ہی معظم علی کا بھائی یوسف احمدین بیگ کے دونوں بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یوسف ایک سال کی ملازمت کے بعد پچاس سواروں کا انفرن بن گیا۔ آصف اور فضل دیار میں اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث ترقی کی منازل نسبتاً زیادہ تیز رفتار سے طے کر رہے تھے۔ آصف ایک سال کی ملازمت کے بعد دوسرا افضل ایک سو سواروں کا کمان دار بن چکا تھا۔ معظم علی کا باپ محمود علی اس عرصے میں ترقی کر کے محافظ فوج کے ایک ہزار سواروں کا انفرن بن چکا تھا۔ اس کے لیے یوسف کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش تھی۔ لیکن معظم علی کے مستقبل کے متعلق وہ پہلے جس قدر پرامید تھا۔ اب اسی قدر پریشان ہو رہا تھا۔ معظم علی نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں سپاہیانہ اوصاف کی کمی تھی۔ محمود علی جانتا تھا کہ اس میں ایک سپاہی کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جرات، ہمت، عزم اور استقلال کے علاوہ وہ ایک غیر معمولی قوت فیصلہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کتابوں سے لچپی کے باوجود اسے سپاہیانہ زندگی پسند تھی وہ ہر روز علی الصبح سواری نیزہ بازی اور نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ تیر کر دیا جو کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا اور اب تک وہ تین شیر اور پانچ جیتے مار چکا تھا۔ لیکن محمود علی جب کبھی اس کے سامنے فوج میں بھرتی ہونے کا مسئلہ چھیڑتا۔ وہ یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتا۔ ابا جان آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ ابھی میری تعلیم پوری نہیں ہوئی ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اور آمنہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی، وہ کہتی: آپ معظم علی کے متعلق اس قدر پریشان کیوں ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے!

معلم علی اپنا زیادہ وقت عبد القدوس کے پاس گزارا کرتا تھا۔ ایک دن محمود علی نے جا کر اس سے شکایت کی۔ دیکھیے قبلہ معظم کے مستقبل کے متعلق بہت بڑی توقعات تھیں اور میرا خیال تھا کہ آپ کی شاگردی سے اس کی خداداد صلاحیتیں اور چمک اٹھیں گی۔ لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر مجھے بے مددایہ سی ہو رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک سو سالہ رہے گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے سوا اسے کسی چیز سے لچپی ہی نہیں۔ اگر میں کسی بڑی جائیداد کا مالک ہوتا تو مجھے تمام عمر اس کے گھر بیٹھنے پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں میری جائیداد صرف تو اسے خدا کے لیے آپ اسے سمجھاتیں!

عبد القدوس نے اطمینان سے جواب دیا: آپ کو معظم علی کے متعلق مایوس نہیں ہونا چاہیے مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ایک سلطنت کو سپاہی کی تلوار کے علاوہ عالم کے قلم کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ معظم علی کسی شہر کا قاضی یا صوبے کا حاکم بننے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آپ اسے پڑھنے کا شوق پورا کرنے دیں، مجھے اس کی خداداد صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق خود فیصلہ کر سکے۔ اگر آپ نے اپنا کوئی فیصلہ اس پر تنہا کرنے کی کوشش کی تو یہ اس کے حق میں مضر ہوگا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے دیں۔ اگر اس نے اپنی مرضی سے سپاہی بننے کا فیصلہ کیا تو اس میلان میں بھی عزت اور شہرت کی کوئی منزل اس سے دور نہیں ہوگی۔

محمود علی نے مطمئن ہو کر کہا: قبلہ میں معظم سے مایوس نہیں ہوں، لیکن اس کے تمام ساتھی فوج میں شامل ہو چکے ہیں اور لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں۔

”لوگوں کی پروا نہ کیجیے، جو جوان اپنے لیے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی عمر کے ایک جھٹے میں لوگوں کے طعنے سننے ہی پڑتے ہیں۔“

عبد القدوس کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد محمود علی کی پریشانی کسی حد تک دور ہو چکی تھی اور اس کے بعد اگر اس کا کوئی دوست یہ سوال کرتا کہ معظم علی فوج میں کیوں شامل نہیں ہوا؟



تو وہ جواب دیتا:

”معلم علی ایک عالم ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے قلم سے بنگال کی زیادہ خدمت کر سکے گا۔“



فرحت گیارہ سال کی عمر سے پردہ کیا کرتی تھی اور معلم نے اسے گزشتہ دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ معلم کی ماں کبھی بھی اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو اس نے معلم علی سے کہا: ”بیٹا آج فرحت تمہارے متعلق پوچھتی تھی!“

معلم علی کے گال اور کان حیا سے سرخ ہو گئے اور اس نے سوال کیا: ”متعلق کیا پوچھتی تھی؟“

ماں نے جواب دیا: ”بیٹا وہ یہ پوچھتی تھی کہ تم فوج میں بھرتی کیوں نہیں ہوتے؟“

معلم نے مسکرا کر کہا: ”امی جان مجھے انوس ہے کہ اب آپ کو میری دگر سے چھوٹی چھوٹی

لڑکیوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔“

ماں نے جواب دیا: ”بیٹا اس نے مجھے طعنہ نہیں دیا بلکہ وہ تو اپنی طرف سے جبرور دی کر رہی تھی۔ اور اب وہ چھوٹی لڑکی نہیں۔ ماشاء اللہ اب وہ جوان معلوم ہوتی ہے اس کی ماں اس

کی پیدائش کے دن سے اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مگر شاید کہ بڑے بڑے

گھرانوں سے رشتے آتے ہوں۔ ایک۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور فرحت ہے جس کی اس قابل کہ

کسی نواب کے گھر جائے۔ مرزا صاحب بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کریں گے۔ مگر

سے مرزا صاحب کے کسی عزیز نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ اور حسین بیگ بھی ضمانت

ہو گئے تھے۔ لیکن فرحت کی ماں نہیں مانتی۔“

معلم جانتا تھا کہ اس کی ماں فرحت سے بہت پیار کرتی ہے اور فرحت کا ذکر آجائے تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اس نے اپنے بوتلوں پر شرارت آمیز تسمیے لگاتے ہوئے

میں کو چلنے کی نیت سے کہا: ”امی جان! فرحت وہی لڑکی تو نہیں جس کی ناک چھٹی اور رنگ

سیاہ تھا بالکل توڑے کی طرح۔ اور اس کی ایک آنکھ بھی ذرا چھوٹی تھی!“

”شرم کرو۔“ ماں نے بڑبڑ کر کہا اور معلم اٹھ کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ دو سال پہلے کی ایک ایسی صورت کے دھندلے سے نفوش اس کے ذہن پر ابھر رہے تھے جو شوخ بھی تھی اور معصوم بھی۔

چند دن بعد ایک خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ معلم علی صبح سویرے کوئی کتاب لینے افضل کے

گھر گیا۔ وہ پہلی ڈیڑھ گھنٹے گزرنے کے بعد اندرونی چادر دیواری کے پھانک کے قریب پہنچا تو

آصف اور افضل فوجی لباس پہنے باہر نکل رہے تھے۔ دو نوکرانہ میں ان کے گھوڑے لیے

کھڑے تھے۔ معلم نے انہیں دیکھتے ہی کہا: ”بھائی! آصف کتے تھے کہ آج چھٹی ہے اور میں کتاب لینے

آ گیا تھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

افضل نے کہا: ”آج چھٹی ہے لیکن ہم چوگان کھیلنے جا رہے ہیں۔ آؤ تم کتاب لے لو۔“

”لیکن جلدی آتا!“ آصف نے کہا: ”وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”ابھی آتا ہوں۔“

افضل معلم علی کو ساتھ لے کر کتب خانے کے سامنے پہنچا تو باہر کے برآمدے کی طرف

کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

افضل نے کہا: ”آج آجا جان باہر گئے ہوئے ہیں اور شاید نوکرانہ اندر سے یہ دروازہ

بند کر دیا ہے۔ آؤ اس طرف چلتے ہیں۔“

وہ واپس مڑے اور دیوان خانے کے ایک وسیع کمرے سے گزر کر اندرونی صحن کے قریب پہنچے تو معلم کچھ سوچ کر رک گیا۔

افضل نے مڑ کر کہا: ”آجاء گھر والے سب اوپر ہیں۔ یہاں کوئی نہیں۔“

معلم علی افضل کے پیچھے صحن سے گزر کر کتب خانے میں داخل ہوا۔ افضل نے کہا: ”اب تم اطمینان سے کتابیں تلاش کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جلتا ہوں۔“

افضل باہر کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ معظم نے ایک الماری کھولی اور کتابیں نکال نکال کر دیکھنے لگا۔ دو تین الماریوں کو دیکھنے کے بعد وہ کونے کی ایک الماری کے پاس کھڑا ایک کتاب کے ورق الٹ رہا تھا۔ اچانک اسے کسی کے پاؤں کی آہٹ اور معاً بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی: بھائی جان آپ ابھی تک ...؟

معظم علی نے مڑ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لیے متحیر سا ہو کر رہ گیا۔ ایک نو عمر لڑکی جب بے خیالی میں کمرے کے درمیان پیچ چلی تھی اس کی نسبت کہیں زیادہ بدحواسی کے ساتھ ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کر رہی تھی معظم علی ایک نظر سے زیادہ اس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا:-

”معاف کیجئے میں ...؟“

معظم علی اپنا نفور پورا نہ کر سکا۔ لڑکی فوراً مڑ کر دروازے کی طرف بھاگی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ روشنی کی کرن کی طرح جو آئینے کو چھونے کے بعد اپنا رخ بدل لیتی ہے یا سمندر کی لہر کی طرح جو ساحل سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے۔

یہ لڑکی فرحت تھی۔ معظم علی نے اسے دو سال کے بعد دیکھا تھا اور وہ بھی ایک لمحہ کے لیے۔ اس کے ذہن میں اس کے کوئی واضح نقوش نہ تھے۔ تاہم اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اگر وہ اسے تمام عمر دیکھتا رہتا تو بھی اس کی نگاہوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں ایک خوشگوار دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن یہ دھڑکن چند لمحوں سے زیادہ نہ رہی۔ معظم علی ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انتہائی سکون کے ساتھ الماری سے ایک اور کتاب نکال کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کا یہ خوشگوار تصادم اس کے نزدیک محض ایک حادثہ تھا۔ ماضی کا حادثہ جس کا اس کے حال اور مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ان کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں اور اگر وہ جھٹک کر تھوڑی دیر کے لیے کسی چوراہے پر ایک دوسرے سے آٹھیں تو بھی ان کی منزل کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ نہ احت مرزا حسین بیگ

کی بیٹی تھی اور وہ اتنا شاعر نہ تھا کہ زمین پر کھڑا ہو کر ستاروں سے باتیں کرتا :-



کوئی آدھ گھنٹہ کی تلاش کے بعد معظم ایک کتاب لے کر باہر نکلا تو برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر اسے حسین بیگ دکھائی دیا۔ معظم نے بڑھ کر اسے سلام کیا اور حسین بیگ نے ”علیکم السلام“ کہہ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ معظم علی نے کہا: میں یہ کتاب لینے آیا تھا۔

برآمدے میں چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حسین بیگ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: معظم بیٹھ جاؤ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

معظم علی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قدم سے توقف کے بعد کہا: ”برخوردار تمہارے متعلق مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے باقی فرائض سے آنکھیں بند کر لو۔ ابھی شبہی عمل کے باہر تمہارے ابا جان ملے تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک سپاہی بن کر اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ شیری علی تمہارے متعلق کہا کرتا تھا کہ تم کسی دن سپہ سالار ہو گے۔ لیکن تم کتابوں کے شوق میں خلا و صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ آخر تم فوج میں شامل ہونے سے کیوں ڈرتے ہو؟ جسمانی لحاظ سے تم بنگال کے ہزاروں نوجوانوں کے لیے قابل رشک ہو۔ نیزہ بازی، شہسواری اور نشانہ بازی میں بہت کم نوجوان تمہارا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ تمہیں خدا نے ذہانت بھی دی ہے، اگر تم اپنے بھائی کی طرح دو سال قبل فوج میں شامل ہو گئے ہوتے تو اب تک شاید دو سو سوار تمہاری کمان میں ہوتے۔ لیکن اگر تمہیں ایک معمولی انسٹر کی حیثیت سے فوج میں شامل ہونا پسند نہیں تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ علی مددی خاں کے ساتھ میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میری مدد میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے چلتا ہوں۔

معظم علی نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: ”چچا جان میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے ابتدائی نہیں



کرنا چاہتا۔ جس فوج کا ادنیٰ سپاہی بننا پسند نہیں کرتا اس کا سپہ سالار بننا بھی پسند نہیں کروں گا۔ جس دن مجھے اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ میں ایک سپاہی بن کر قوم اور وطن کی کوئی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔ اس دن میرے سامنے یہ سوال نہیں ہوگا کہ میں ایک سپاہی ہوں یا سپہ سالار میرے سامنے صرف یہ سوال ہوگا کہ میں نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی ہے وہ کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔ اپنے ضمیر کا اطمینان میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا۔

حسین بیگ نے کہا: ”اور وہ دن کب آئے گا جب تم قوم اور وطن کے لیے تلوار اٹھانے کی ضرورت محسوس کرو گے؟“

مستظم علی نے جواب دیا: ”جب ہماری قسمت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جو اجتماعی حیات کے اصولوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں ہماری سب سے بڑی بیماری ہماری لامرکزیت ہے اور اس لامرکزیت کا باعث ان بیشمار طالع آزمائوں کی ہوس اقتدار ہے جو ہندوستان کو اپنی چھوٹی چھوٹی شکار گاہوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک سپاہی کی تلوار چند امرار کی مسندوں کی حفاظت کر کے ان کے اقتدار کی مدت میں چند مہینوں یا چند برسوں کا اضافہ کر سکتی ہے لیکن قوم کی اجتماعی بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔“

حسین بیگ اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے قد سے تلخ ہو کر کہا: ”ہماری گفتگو بنگال کی فوج کے متعلق تھی جو ایک طرف مرہٹوں کی لوٹ مار اور دوسری طرف الیٹ انڈیا کمپنی کے جارحانہ عزائم کے خلاف ہمارا واحد سہارا ہے۔“

مستظم علی نے جواب دیا: ”جی ہاں، لیکن برہمنی سے ملی دردی خاں کی فوج کے سپاہیوں اور برہمنیوں

کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگال کے دوست کون ہیں اور دشمن کون ہیں؟“

حسین بیگ فطرتاً حکومت پسند تھا اور ملی دردی خاں اسے اُسے غایت درجہ کی عقیدت تھی۔

وہ بنگال کے حکمران کی ذات کو تنقید یا تنبیہ سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ

اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا: ”برخوردار مجھے امید ہے کہ ملی دردی خاں کے متعلق بات کرتے وقت

تم سنجیدگی کا ثبوت دو گے اور اس بات کا لحاظ رکھو گے کہ وہ ہمارا حکمران ہے۔“

مستظم علی نے کہا: ”بچا جان معاف کیجئے، میں نے ملی دردی خاں کی ذات کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا، بیشک وہ ہمارا حکمران ہے۔ لیکن اگر کوئی حکومت اپنے اعمال پر نکتہ چینی کا حق مجھے نہیں دیتی تو وہ مجھ سے اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے ملی دردی خاں کی بہت سی غریبوں کا اعتراف ہے۔ ملک کے کئی دوسرے حکمرانوں سے وہ یقیناً بہتر ہیں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس سلطنت کی مرکزی قوت نہ ہونے کے برابر ہو وہ زیادہ دیر کی قوم کی آزادی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ آپ اس بات کا اعتراف کریں گے کہ دہلی میں مسلمانوں کی سطوت کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں اور عالمگیر کی عظیم سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے گھر دندے تعمیر کرنے والے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کی جگہ جس کسی اجتماعی نصب العین کے حصول کے لیے نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہے۔ مسلمان صدیوں کی حکومت کے بعد نہایت العوم اب بتدریج اس تباہی کا سامنا کر رہے ہیں جو اقتدار اور لامرکزیت میں مبتلا ہونے والی اقوام کی آخری سزا ہوتی ہے۔“

حسین بیگ نے کہا: ”عالمگیر کے جانشین نااہل ہیں اور اب اگر تم دہلی کے دوبارہ کی حالت دیکھو تو ملی دردی خاں جیسے لوگوں کا دم غنیمت سمجھو گے۔ اگر ایسے لوگ دہلی کے نااہل اور منہوج حکمرانوں سے مایوس ہو کر اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے تو اب تک سارا ملک ہمارے دشمنوں کے قبضے میں چلا جاتا۔ آج مرشد آباد، لکھنؤ اور حیدر آباد کے حالات یقیناً دہلی کے حالات سے بہتر ہیں۔“

آپ درست کہتے ہیں لیکن آپ آج کی بجائے کل کے متعلق سوچیں۔ درخت سے کٹی ہوئی

شاخیں زیادہ دیر سبز نہیں رہتیں۔ میں اورنگ زیب عالمگیر کے نااہل جانشینوں سے کہیں زیادہ

ان قسمت آزمائوں کو موجودہ حالات کا ذمہ دار سمجھتا ہوں جن میں کسی اچھے حکمران کو مسند حکومت پر

بٹھانے کی جرات و ہمت یا دیانت نہ تھی۔ دلی کے نااہل، منہوج اور بے بس حکمران ان کی

گردہی سیاست کی پیروی کرتے۔ لال قلعہ ان کے لیے زور آزمائی کا اکھاڑ تھا۔ بادشاہوں

کے تاج ان کے ہاتھوں کے کھلنے تھے۔ ہر گروہ کی یہ خواہش تھی کہ دہلی کے حکمران کی حیثیت ایک بے بس دعا گو سے زیادہ نہ ہو۔ اور وہ اس کی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ ایک گروہ کسی نااہل حکمران کو اپنی بساط سیاست کا مہرہ سمجھ کر تخت پر بٹھاتا تھا اور دوسرا گروہ اسے تخت سے اتار کر اس سے زیادہ نااہل امیدوار کے سر پر تاج رکھنے کی جدوجہد شروع کر دیتا تھا۔ اگر ان حالات سے فائدہ اٹھا کر دہلی سے باہر چند صوبہ داروں نے اپنے سردوں پر چھوٹے چھوٹے تاج رکھ لیے ہیں تو ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔

اگر دہلی کے امرا نیک نیت ہوتے اور ان کی سیاست قوم کے اجتماعی مفاد کے تابع ہوتی تو وہ یقیناً اپنی ذاتی سودا بازوں کی خاطر نااہل حکمران تلاش نہ کرتے۔ انھوں نے جس مستعدی کے ساتھ چند فرائض عملی حکمرانوں کو تخت پر بٹھانے کی جدوجہد کی تھی۔ اگر اسی مستعدی کے ساتھ کسی جہاں کی نصب العین کے حصول یا کسی ضابطہ اخلاق کی فتح کے لیے جدوجہد کرتے تو وہ دہلی کے تخت کے لیے بہترین حکمران تلاش کر سکتے تھے لیکن وہ کسی ہول یا ضابطہ اخلاق کی فتح کو اپنی ذاتی خواہشوں اور انگلیں کی شکست سمجھتے تھے۔ وہ کسی ہول یا مقصد کے لیے قربانی دینے کی بجائے ہر اصول اور مقصد کو اپنی ذاتی خواہشات پر قربان کرنا سیکھ چکے تھے۔ دہلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکمران برے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے ضابطہ سلطنت کے ستون کہلاتے تھے ہر لڑائی میں اپنی بھلائی تلاش کرتے تھے۔

حسین بیگ کے لیے معظم علی کی گنگو کا صرف وہ حصہ قابل توجہ تھا جو بنگال اور ملی وردی خاں کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ دہلی کے امرا سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور معظم علی اگر ان کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتا تو بھی اسے اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے کہا: برخوردار مجھے دہلی کے امرا یا حکمرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر انھوں نے برائی کا بیج بویا تھا تو انھیں کئی بار اس کی سزا ملی چکی ہے۔ دہلی کئی بار مرہٹوں اور جاٹوں کے ہاتھ لٹ چکا ہے لیکن ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے ایسے حالات میں بھی بنگال، اودھ اور دکن کو تباہی سے بچا لیا ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ بنگال میں علی وردی خاں یہ ماری عورت اور آزادی کا آخری محافظ ہے۔ خدا

کرے اس کا سایہ چند برس اور ہمارے سر پر ہے اور تم جیسے نوجوان بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساں کریں!“

حسین بیگ ان الفاظ پر اس ناخوشگوار بحث کو جو اس کے لیے کافی حد تک ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن معظم علی نے کہا،

بچا جان آپ برا نہ مائیں مستقبل کے مورخ ان صوبہ داروں کو موجودہ صورت حالات کی خرابی سے بری الذمہ قرار نہیں دیں گے جنھوں نے دہلی کے دربار کی سازشوں سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کو پس میں تقسیم کر لیا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی پوری سلطنت پر قبضہ کر لیتا اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ قوم کو تباہی سے بچایا جائے تو کم از کم میں اس سے اس کا حسب و نسب نہ پوچھتا۔ اگر وہ اپنے کردار سے قوم کا نجات دہنہ ثابت ہوتا تو میں ایک رضا کار کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا۔ اس کی فوج کا معمولی سپاہی بن کر مجھے یہ اعتماد ہوتا کہ جب وہ کوئی غلط قدم اٹھائے گا تو میں اسے روک سکوں گا۔ اس کی انگلیں میری انگلیں ہوتیں، اس کے دل کی دھڑکنیں، میرے دل کی دھڑکنیں اور اس کے ضمیر کی آواز میرے ضمیر کی آواز ہوتی۔ اور اس کی شکست کو میں اپنی شکست سمجھتا۔ پھر ایسے شخص کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طالع آزمائوں کے کسی گروہ کی حمایت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ ایک مقصد کے لیے ایثار اور قربانی کا دلولہ کر میدان میں نکلتا اور عوام کی اجتماعی قوت اس کے ساتھ ہوتی۔ وہ عوام کے لیے جھوپڑے تعمیر کرتا اور اس کے اقتدار کی سند مرمری ایوانوں کی بجائے ان کے دلوں میں ہوتی۔ لیکن یہ لوگ جنہیں آپ قوم کا نجات دہنہ خیال کرتے ہیں۔ مجھے کسی ایسے اجتماعی اصول کے علمبردار نظر نہیں آتے جس کی فتح کو قوم کی فتح سمجھ سکوں۔ یہ لوگ ہمارے احساس اور خود کی بجائے ہماری بے حس کی پیداوار ہیں۔ ان کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر پھیلی ہوئی ہیں اور جیسے گرانے کے لیے ہوا کا ایک جھونکا کافی ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیں مرہٹوں کی لوٹ مار اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری سے بچانا چاہتے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت



نہیں کہ وہ ایک دن مرہٹوں کے غلات جنگ کرتے ہیں اور دوسرے دن ان کے دوست بن جاتے ہیں اور اگر مرہٹے انہیں سہرا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو وہ اپنے مسلمان ہمسایہ پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر گریز ہماری آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ لیکن ان میں سے کون ہے جس نے اپنی کسی نہ کسی ذاتی مصلحت کے پیش نظر انگریزوں کو اس ملک میں پاؤں جمانے کے لیے مدد نہیں دی؟ ان کا منہائے نظر صرف ذاتی اقتدار ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے یہ لوگ کسی دن قوم کی بقا کو بھی داؤں پر لگا دیں گے۔

حسین بیگ نے جھنجھلا کر کہا: تم ملی وردی خاں کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکتا ہے یا قوم کی آزادی کو داؤں پر لگا سکتا ہے۔

حسین بیگ کے تہد دیکھ کر معظّم چند تانیے خاموش رہا۔ بالاخر اس نے کہا: چچا جان میں نے یہ بتایا اس لیے کہ میں آپ کی بے عزت کرتا ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ملی وردی خاں کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات سے آپ میری نسبت کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن میں جس چیز کو خطرناک سمجھتا ہوں وہ ان کی مصلحتیں ہیں۔ ایک ایسے حکمران کی مصلحتیں، جس کا اقتدار کسی مقصد کے لیے جہد و جد کا ثمر نہیں بلکہ اپنی ذاتی ذہانت اور حکمت عملی کا نتیجہ ہے جو لوگ کسی مقصد کیلئے جہد و جد کرتے ہیں، ان کی سب سے بڑی پونجی وہ تربیت یافتہ عوام ہوتے ہیں جسے وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے بیدار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اقتدار اگر لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو تو عوام کا اجتماعی شعور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو تو رائے عامہ ان کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے قسمت آزمائش کے لوگوں سے جوڑ توڑ یا سودے بازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ساری قوم اپنے دوست سمجھتی ہے۔ ان کے دشمن سب کی نگاہوں میں دشمن ہوتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی تمام ذاتی خوبیوں کے باوجود ملی وردی

خاں کا شمار ایسے لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے صرف اپنی ذاتی قابلیت یا ہوشیاری کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی ہے۔ اور اس حکومت کے تحفظ کے لیے بھی وہ چند ہوشیار آدمیوں کی حمایت یا دوستی کافی سمجھتے ہیں۔ بنگال کو جب کوئی اندرونی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ انگریزوں یا مرہٹوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بیرونی خطرہ درپیش ہو تو وہ اپنے بدترین غداروں کو بھی معاف کرے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بیشک وہ ایک ہوشیار سیاست دان اور تجربہ کار جرنیل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بنگال کے سپاہی کبھی تک یہ معصوم نہیں ہو سکا کہ اس کا حال محاذ کماں ہے۔

حسین بیگ کا چہرہ غصے سے تھما رہا تھا۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا:

”تم تو اس کا مطلب یہ ہو کہ ملی وردی خاں انتہائی ناقابل اعتماد آدمی ہے جو حسب ضرورت اپنے دوست اور دشمن بدلتا رہتا ہے؟“

معظّم ملی نے جواب دیا: میں نے ملی وردی خاں کو ناقابل اعتماد نہیں کہا لیکن اگر آپ بڑا ناہن تو یہ ضرور کون گا ان کے گرد ایسے آدمی جمع ہیں جنہیں میں قابل اعتماد نہیں سمجھتا اور اگر ان کے سامنے ایک حکمران کی ذاتی مصلحتیں نہ ہوتیں تو ان کے دہلیز میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی۔

حسین بیگ نے کہا: ادم یہ بھی کہتے ہو کہ ملی وردی خاں کے سپاہیوں کو یہ علم نہیں کہ ان کا محاذ کماں ہے؟

”جی ہاں اور میں غلط نہیں کہتا!“

”شاید ملی وردی خاں کو بھی یہ علم نہ ہو کہ ان کا محاذ کماں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے

بتاؤ اور میں اس کے کانوں تک تمہاری یہ آواز پہنچا دوں؟“

معظم علی نے حسین بیگ کی طنز سے بھری ہوئی مسکراہٹ کی کوئی پروا نہ کی۔ اس نے جواب دیا: ”جی انھیں بتلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے جعفر جیسے لوگ کسی کے دُعا نہیں ہو سکتے۔“

سین بیگ کو میر جعفر کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی تاہم وہ علی دردی خاں کی فوج کے ایک افسر کے بیٹے کی زبان سے اس کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ”دیکھو برنورد اگر تم فوج میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا لیکن علی دردی خاں کے ساتھیوں کے متعلق زبان کھولتے وقت تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ لوگ سلطنت کے ستون ہیں اور تمہارا والد فوج کا ملازم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے خیالات اس قدر باطنیہ ہیں۔ میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر تمہاری باتیں سنی ہیں۔ لیکن اس مکان کی چار دیواری سے باہر اگر تم نے کسی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کیں تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ تم افضل اور آصف کے دوست ہو اور میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم ان کے سامنے ایسے خیالات کی تبلیغ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ لیکن دقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ علی دردی خاں بنگال کے مسلمانوں کا آخری سہارا ہے۔“

معظم علی نے کرسی سے اٹھ کر کہا: ”چچا جان اگر میں نے کوئی تیغ بات کہہ دی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ یقین رکھیں دقت آنے پر میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل مجھے کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔“

اگلے روز معظم اور یوسف اپنے باپ کے ساتھ عشا کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ حسین بیگ کے نوکر نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ رک گئے اور نوکر نے قریب آکر محمود علی سے مرزا صاحب نے آپ کو بلا دیا ہے۔

محمود علی نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تم جاؤ میں ان سے مل آؤں۔“

www.pdfbooksfree.pk

محمود علی نوکر کے ساتھ چلا گیا تو یوسف نے معظم علی سے کہا: ”معظم مرزا صاحب نے پہچان لیجئے دست بلایا ہے۔ خیر تو ہے؟“

معظم نے جواب دیا: ”بھائی جان معلوم ہوتا ہے آج میری شامت آئے گی۔ کیوں کیا ہوا؟“

”کل میری باتوں سے مرزا صاحب خفا ہو گئے تھے۔“

”کیوں، تم نے ان سے کیا کہا تھا؟“

”وہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کے متعلق پریشان تھے۔ اور میں نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”اور اب وہ زیادہ پریشان ہوں گے۔ تم نے علی دردی خاں کے متعلق ضرور کوئی ایسی دسی بات کہی ہوگی؟“

”میں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کیا تھا اور انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ میں علی دردی خاں کی حکومت کا باغی ہوں۔“

”تمہیں مرزا صاحب کے ساتھ نہیں الجھنا چاہیے۔ وہ پرانی دُشمنی کے آدمی ہیں، اور علی دردی خاں کے ساتھ ان کے مراسم بہت گہرے ہیں۔“

یوسف اور معظم نے نماز کے بعد کچھ دیر محمود علی کا انتظار کیا اور پھر گھر کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچ کر وہ صحن میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محمود علی بھی آگیا اور اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کہا: ”معظم! تم نے کل مرزا صاحب سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”ابا جان میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میرے فوج میں بھرتی نہ ہونے کی وجہ خوف یا کاہلی ہے۔ مرزا صاحب بہت زیادہ خفا تو نہیں تھے؟“

”نہیں بلکہ وہ اس بات پر پریشان تھے کہ وہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے تاہم



وہ تاکید کرتے تھے کہ تمہیں سی دودی خاں اور ان کے اصرار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

معظم علی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ”اباجان انھوں نے یہ قہرور کہا ہو گا کہ میں بہت نالائق ہوں؟“

نہیں وہ یہ کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا میرے لیے ایک ممتا ہے کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک سادہ دل فوجان ہے اور کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہے۔ وہ کہتے تھے ایسے فوجان یا تو دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں اور اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے ہیں۔

معظم علی نے کہا: ”اباجان میں بھائی جان سے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ وہ میری شکایت کریں گے اور آپ ٹھہرا کر میری خوب مرمت کریں گے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ وہ آٹھو بجے اپنے ٹھہر کر چل دیں گے تو میں نہیں چھٹکے دیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی چمپے آدمی ہیں۔“

تم نے ان سے میرے جگر کے خلاف کچھ کہا تھا؟

جی ہاں۔

وہ ہر اس آدمی کو اچھا سمجھتے ہیں جو میرے جگر کو برا خیال کرتا ہے۔

لیکن انھوں نے مجھے تو ڈانٹ دیا تھا۔

یہ ان کی ظاہر داری تھی لیکن تمہیں ایسے خیالات کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔

اباجان میں محتاط رہیں گا۔

مرزا صاحب ایک اور بات کہتے تھے۔

وہ کیا؟

وہ کہتے تھے کہ معظم علی کے لیے میرے کتب خانے کا دواخانہ ہر وقت کھلا رہے گا۔ لیکن مجھے اس میں خوشی ہوگی جب میرے آپٹو خانے سے تو اور میرے آپٹل سے گھر لائے آئے گا۔

## دوسرا باب

ایک دن مرشد آباد میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ پنڈت بھاسکر کی قیادت میں رانگھوجی بھونسو کی چالیس ہزار مرہٹہ فوج برطانوی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ علی دودی خاں مرشد آباد سے باہر شکار کیل رہا تھا۔ اس نے مرہٹوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی برطانوی کا رخ کیا اور مرشد آباد اور دوسرے شہروں کی افواج کو یہ حکم بھیجا کہ وہ راستے میں اس کے ساتھ آئیں۔ دو دن کے اندر اندر مرشد آباد کی چھاؤنی خالی ہو گئی اور سپاہیوں کے صرف چند دستے شہر اور شاہی محل کی حفاظت کے لیے رہ گئے۔ چند دن بعد یہ خبر آئی کہ علی دودی خاں کا ایک کمان دار میر حبیب اور فوج کے چند اور افسر بنگال سے مدداری کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور پنڈت بھاسکر نے یہ اعلان کیا ہے کہ بنگال کی فوج سے مدداری کرنے والوں کو مرہٹہ فوج میں اپنے سابقہ عہدوں پر لے لیا جائے گا۔ مرشد آباد میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

عمود علی، یوسف علی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹے آصف بیگ اور افضل مرشد آباد کی فوج کے ساتھ نماز جنگ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

معظم علی کو پہلی بار نہایت شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ محض کے وہ لوگ جن کے لیے جنگ کے لیے جا چکے ہیں۔ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شاہی محل کا داروغہ معظم علی کے باپ کا دوست تھا اور وہ ہر روز علی الصباح اس کے پاس جنگ کے تازہ حالات معلوم کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ دواخانے

مل کر واپس آیا تو اسے اپنی ماں کا چہرہ بے حد مغموم دکھائی دیا۔

”کیا ہوا امی جان؟“ اس نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بیٹا! کوئی اچھی خبر آئی ہے؟“

”ہاں امی جان آج کی خبریں کچھ اچھی ہیں۔ مرنے والے چند گھنٹوں کے بعد پیچھے ہٹ گئے

میں لیکن ابھی کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں ہوا۔ آپ اس قدر لگن کبوں ہیں؟“

”بیٹا! ماں نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے فرحت سے یہ توقع نہ تھی“

”کیا ہوا امی جان؟“ معظّم نے بدحواس ہو کر سوال کیا۔ ”فرحت نے کیا کہا؟“

”اس میں فرحت کا قصور نہیں بیٹا۔ اصل میں وہ لڑکیاں جو اس کے ساتھ آئی تھیں بہت

بدتمیز تھیں۔“

”فرحت یہاں آئی تھی؟“

”ہاں وہ ابھی گئی ہے۔“

”آخر کیا کیا اس نے؟“

”ماں نے اٹھ کر ایک الماری سے کپڑے کی چند چوڑیاں نکالیں اور معظّم علی کو دکھاتے ہوئے

کہنے لگی: ”فرحت آج اپنی چند سیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ساتھ سلطان خاں کی

لڑکی بھی تھی مجھے وہ کبھی پسند نہیں آئی۔ لیکن آج اس نے بہت زیادتی کی۔ پہلے اس نے یہ

کہا کہ تم بزدلی کی وجہ سے فوج میں شامل نہیں ہوئے، پھر اس نے اپنی چوڑیاں تار کر میرے سلنے

رکھ دیں اور کہنے لگی معظّم جانی کو ہماری طرف سے یہ تحفہ دے دیجیے۔“

”تھوڑی دیر کے لیے معظّم علی کی رگوں کا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آگیا۔ اس نے

کہا: ”اور فرحت نے کیا کیا؟“

”فرحت نے کچھ نہیں کہا مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی سیلیوں کا منہ بند کرے گی۔ لیکن وہ

خاموشی سے ہنستی رہی۔“

”امی جان اگر آپ کو ایسی باتوں سے صدمہ ہوا ہے تو میں اکیلا مرٹوں کے لشکر کے سامنے

کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وقت آنے پر کوئی آپ کے بیٹے کو بزدل نہیں کہے گا اور

وہ سلطان خاں جس کی صاحبزادی نے آپ کو میرے لیے چوڑیاں دی ہیں خود مرٹوں کے

حملے کی خبر سننے ہی شہر سے ہجرت کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے دکا

تھا۔ امی جان میں فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا کہ موجودہ حالات میں میرا مرٹوں کا دین رہنا

زیادہ ضروری ہے۔ شہر سپاہیوں سے قریباً خالی ہو چکا ہے۔ اگر دشمن نے اس صورت حال سے

فائدہ اٹھا کر چند تیز رفتار دستے اس طرف بھیج دیئے تو یہ محض تودرکنار شاہی محل بھی محفوظ نہیں

رہے گا اور شہر سے باہر یہ ہمارا محض تودرکنار ہی غیر محفوظ ہے۔ میں مرزا صاحب کے پاس جا رہا ہوں

۔ لیکن بیٹا خدا کے لیے فرحت کی شکایت نہ کرنا۔ اس کی نیت بری نہ تھی۔“

”معظّم علی نے کہا۔ ”نہیں امی جان میں آصف اور افضل کی بہن کی شکایت نہیں کر سکتا

لیکن یہ چوڑیاں سنبھال کر رکھیے۔“



”معظّم علی حسین بیگ کے محل میں داخل ہوا تو وہ بیرونی احاطے میں بندوق سے نشاندہ بازی

کر رہا تھا اور آٹھ دس سپاہی اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظّم علی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا اور جب

حسین بیگ اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے کہا:۔

”چچا جان آج میں کتب خانہ کی بجائے آپ کا اسلحہ خانہ دیکھنے آیا ہوں۔“

حسین بیگ مسکرایا۔ ”تمہیں توار کی ضرورت ہے یا بندوق کی؟“

”ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کے کتب خانے میں ڈیڑھ ہزار کتابیں ہیں۔ میں یہ

جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے اسلحہ خانے میں کتنا سامان ہے؟“

”اگر استعمال کرنے والے ہوں تو سامان بہت ہے۔ لیکن میں تمہاری اس چالاک

فریبی کی وجہ نہیں سمجھ سکتا۔“



مظلم علی نے جواب دیا: "شرفِ جہ سے خالی ہو چکا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن نے ہوشیاری سے کام لیا تو مرشد آباد پر اچانک قبضہ کر لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اور یہ محلہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو آپ کا مکان اس محلے کے لیے قلعے کا کام دے سکتا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر مجھے کسی فوجی عہدہ کی ضرورت ہو تو آپ میری سفارش کر سکتے ہیں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس قلعے کا محافظ مقرر کر دیا جائے۔"

حسین بیگ نے کہا: "لیکن میرے پاس صرف پندرہ تربیت یافتہ سپاہی اور پانچ چھ بیکار نوکر رہ گئے ہیں۔ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو تم اتنے آدمیوں کے ساتھ کیا کر سکو گے؟ آدمیوں کی فوج نہ کیجیے۔ خطرے کے وقت محلے کا ہر آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انھیں تربیت دینے کا موقع مل جائے۔ انھیں اسلحہ اور بارود کی ضرورت ہوگی اور یہ فراہم کرنا آپ کا کام ہوگا۔"

"برخوردار تم نے میرا اسلحہ خانہ نہیں دیکھا۔ میرے پاس کوئی اڑھائی سو بندوقیں اور قریباً اتنے ہی پستول اور تلواریں ہیں۔ بارود اتنا ہے کہ اگر استعمال کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہفتے میں بھی ختم نہیں ہوگا۔ دو توپیں جو میں نے پانچ سال قبل خریدی تھیں اندر پڑی ہوئی ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انھیں کہاں نصب کیا جائے۔ اب اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو یہ فیصلہ اس قلعے کا محافظ کرے گا۔"

"تو آپ کو میری خدمات منظور ہیں؟"

حسین بیگ نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "مظلم علی میں تمہیں اپنے قلعے کا محافظ اور پانی ان افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں جن کی تعداد سرِ دست پندرہ تربیت یافتہ اور چھ غیر تربیت یافتہ سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔"

مظلم علی نے کہا: "آپ کا سپہ سالار آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

حسین بیگ نے مظلم کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا: "میں میں تم سے کبھی مایوس نہ تھا۔"

مظلم نے کہا: "میں آج ہی اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ آج شام آپ محلے کے باہر لوگوں کو یہاں جمع ہونے کی دعوت دیں!"

"بہت اچھا، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اچانک یہ خیال کیسے آیا ہے کہ مرشد آباد کو واقعی کوئی خطرہ ہے؟"

"چچا جان اگر خطرہ نہ ہو تو مجھے ہمیں تیار رہنا پڑیے۔ ابھی آپ نشاد بازی کی مشق کر رہے تھے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ آپ ہنگامی حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہیں؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "یہ درست ہے کہ محاذ پر اپنے سپاہی بھیج دینے کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر کوئی سر پہرا اس طرف آنکے تو ہم کیا کر سکتے ہیں مجھ سے زیادہ ہمارے گھر میں فرحت ایسی باتیں سوچا کرتی ہے جس دن سے آصف اور افضل گئے ہیں۔ وہ صبح شام باقاعدہ نشاد بازی کی مشق کیا کرتی ہے۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو ہمارے گھر میں گھس آئے ہیں۔ احتیاط کرنا اچھی بات ہے تاہم میں یہ نہیں سمجھتا کہ مرہٹے محاذِ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلیں گے۔ لیکن تم اس مسئلہ میں بہت سنجیدہ ہو اور تمہاری باتوں سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرہٹوں کا لشکر واقعی مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔"

مظلم علی نے کہا: "چچا جان میرے خدشات بلاوجہ نہیں۔ مرہٹے فتح کی بجائے لوٹ مار کے لیے آئے ہیں۔ اب تک انھوں نے اپنے راستے کی بستیوں اور شہروں کو برباد کیا ہے لیکن بہت کم مقامات ایسے ہیں جن پر انھوں نے قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ بنگال کی زیادہ دولت مرشد آباد میں ہے اور ہمارے ہزار

جوان کے ساتھ چلے ہیں۔ انہیں یہ بھی بتا چکے ہوں گے کہ مرشد آباد پر حملہ کرنے سے کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ محاذ جنگ سے ہماری فوج کی توجہ ہٹانے کے لیے چند دسے اس طرف بھیج سکتے ہیں۔ آپ میرے صیب کو جانتے ہیں وہ ایک ہوشیار آدمی ہے۔ اور مرشد آباد کے چہرہ چتر سے واقف ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک مرشد آباد پر قبضہ کر چکا ہوتا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ جگت سیٹھ نے اپنے محل کی حفاظت کے لیے ڈیڑھ سو آدمی بھرتی کیے ہیں اور ہمارے شاہ شیر علی کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ آج صبح جب میں محاذ جنگ کی خبریں معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کے داروغہ کے پاس جا رہا تھا تو راستے میں شیر علی خاں ملے اور انھوں نے اصرار کیا کہ میں جگت سیٹھ کی ملازمت کر لوں۔ لیکن نے جواب دیا کہ میں ایک کروڑ پتی مہجن کے خزانوں کی حفاظت کرنے کی بجائے اپنے محلے کے کسی غریب آدمی کے دروازے پر پرہرہ دینا بہتر سمجھتا ہوں چچا جان ہو سکتا ہے کہ میرے خدشات محض دہم ثابت ہوں۔ لیکن جب تک جنگ ختم نہیں ہوتی اور ہماری فوج واپس نہیں آتی میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کی دفاعی حالت کیسی ہے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔

”بہت اچھا تم اپنا کام کرو، میں محلے کے آدمیوں کو دعوت بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر حسین بیگ اپنے نوکرؤں کی طرف متوجہ ہوا۔“ تم سب اچھی طرح سن لو کہ آج سے معظم علی تمہارا ناکم ہوگا اور اسے کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“



شام کے وقت حسین بیگ کے دسترخوان پر محلے کے تیس چہرہ آدمی جمع تھے پہلے حسین بیگ نے انھیں جمع کرنے کی غرض و نیت بیان کی اور اس کے بعد معظم علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہانوں کی اکثریت یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ محض احتیاط کے طور پر اپنے اپنے زیر اثر لوگوں کو منظم کرنے کے لیے تیار تھے

صرف دس آدمی ایسے تھے جنہیں حسین بیگ اور معظم علی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق تھا اور جنہوں نے ان کے ساتھ صدق دل سے تعاون کا وعدہ کیا۔

اگلے دن صرف بیس نو عمر لڑکے اور تیس بڑی عمر کے آدمی جن میں سے اکثر محلے کے غریب دکاندار، مزدور اور چند امیر گھروں کے نوکر تھے۔ حسین بیگ کے مکان پر حاضر ہوئے حسین بیگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن معظم علی کے نزدیک یہ ابتداء بڑی نہ تھی۔ اس نے اسلحہ خانے سے ہندو قس نکال کر ان میں تقسیم کیں اور انھیں محلے سے باہر ایک کھلے میدان میں نشانہ بازی کے لیے لے گیا۔ دوسرے دن پندرہ اور آدمی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بعد معظم علی سے فوجی تربیت حاصل کرنے والے رضا کاروں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی۔

اس کے اپنے دو نوکر صابر اور جمال خاں بھی رضا کاروں میں شامل ہو چکے تھے جمال خاں چند برس بنگال کی فوج میں ملازمت کر چکا تھا۔ لیکن صابر کو تلواریں بندوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف جمال خاں کی رقابت کی وجہ سے رضا کاروں کی پریڈ میں شامل ہوتا تھا۔ تین دن اپنے ساتھیوں کے قہقہے سننے کے بعد ایک روز محض اتفاق سے اس کا پہلا نشانہ زہرت پر لگا اور وہ بندوق وہیں پھینک کر بھاگتا ہوا معظم کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں چلایا:

سرکار میرا نشانہ ٹھیک ہو گیا ہے اب مجھے چھٹی دیجیے، گھر میں بہت کام ہے۔“

معظم علی کی یہ مہم اب آہستہ آہستہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے اور کچھ مجبوراً اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہر روز تین چار گھنٹے رضا کاروں کو تربیت دینے کے بعد حسین بیگ کے محل میں چلا جاتا۔ جہاں حسین بیگ نے اس کی ہدایات کے مطابق چالیس مزدور پرانی دیواریں مرمت کرنے اور مختلف مقامات پر مورچے بنانے کے کام پر لگانے تھے۔ معظم علی ان کا کام دیکھتا۔ محل کے مختلف گوشوں میں چکر لگاتا اور اگر کوئی نئی بات ذہن میں آتی تو انہیں ہدایات دے کر چلا آتا۔ پھر وہ محلے کی گلیوں میں پھرتا اور خاص خاص مقامات



پر مورچے تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا چند دنوں میں مٹنے کی مرگی کے ناکے پر پھانگ لگ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ بھی اس کام میں دلچسپی لینے لگے جو چند دن پہلے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اس کا مذاق اڑاتا کرتے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد قریباً ہر روز اس کے چند چہرہ چہرہ ساتھی حسین بیگ کے مکان پر جمع ہو کر دن بھر کی کارگزاری کا جائزہ لیتے اور اگلے دن کے لیے پروگرام بناتے۔



ایک دن مرزا حسین بیگ کی دعوت پر شیر علی نے اس کی حویلی کے دفائی انتظامات کا معائنہ کیا۔ ڈیڑھ سی سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا ناصلہ پر اینٹوں کے ستون تعمیر ہو رہے ہیں۔ اس کے استفسار پر معظم علی نے بتایا کہ فصیل زیادہ چوڑی نہیں۔ جب ان ستونوں پر لکڑی کے تختے ڈال دیئے جائیں گے تو سپاہیوں کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ فصیل کا کنارہ ذرا اونچا ہو گا۔ اور یہ سپاہیوں کے لیے ڈھال کا کام دے گا، باقی تین طرف یہ کام ختم ہو چکا ہے۔ چلیے آپ کو دکھاتا ہوں۔

شیر علی نے بیرونی احاطے میں فصیل کا چکر لگانے کے بعد حسین بیگ سے کہا: مرزا صاحب آپ نے تو اس مکان کو قلعہ بنا دیا ہے۔

معظم علی نے کہا: ڈیڑھ سی کی چھت پر بھی ہمارا مورچہ کافی مضبوط ہے لیکن یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر دقت ہوتا تو میں مرزا صاحب کو یہ چار دیواری گرا کر فی فصیل تعمیر کرنے کا مشورہ دیتا۔ چلیے آپ کو اندرونی حصہ دکھاتا ہوں!

شیر علی ان کے ساتھ اندرونی احاطے میں داخل ہوا۔ معظم علی نے اسے رہائشی مکان کی سنجلی منزل کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ریت کی دیواریں کے مورچے دکھانے کے بعد کہا: آپ اسی قسم کے انتظامات بالائی منزل میں بھی دیکھیں گے۔ میں نے چھتوں پر بھی مورچے بنوا دیئے ہیں اگر دشمن اندرونی احاطے تک پہنچ گیا تو اسے ہر کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ چھتوں اور برآمدوں کے مورچوں سے گولیوں کی بارش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم

میں ان انتظامات کو کافی نہیں سمجھتا۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اندرونی احاطے کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اور ان کی بلندی بھی زیادہ نہیں۔ دشمن بیرونی احاطے میں داخل ہونے کے بعد انہیں آسانی سے چھاند کر اندر آ سکتا ہے ان کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ انہیں اونچا بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اس کے آگے ایک خندق کھود دی جائے اور اسے پانی سے بھر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر دقت ملا اور مرزا صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تو خندق کے ساتھ بانس گاڑ دیئے جائیں گے، جو قریباً ایک گز زمین کے اندر اور کوئی اٹھالی گز زمین کے باہر ہوں گے۔ بانس کی یہ بائٹھ زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ دشمن دیوار پھانڈنے اور خندق عبور کرنے کے بعد براہ راست رہائشی مکان میں مہارے آخری مورچوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ مکان کے مورچوں سے ہماری گولیاں خندق میں گرنے والوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیں گی۔ مرزا صاحب کے پاس دو توپیں ہیں اور انہیں دروازے کے سامنے نصب کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس طرف صحن میں ایک کھائی کھودی جائے گی جس میں پچاس ساٹھ سپاہی چھپ کر بیٹھ سکیں گے۔ اگر دشمن نے دروازہ توڑ کر اندر آنے کی کوشش کی تو اسے سب سے پہلے ہماری توپوں کی آتش بازی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی یہ تمام انتظامات عارضی ہیں اور ایک فیہ متوقع حملے کے پیش نظر کیے گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مرچے بیرونی فصیل توڑنے یا پھانڈنے کے بعد کسی منظم فوج کی بجائے ایک میلے کی بھیڑ کی شکل میں اندرونی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ اور ان کا نصب ایمن صرف ٹوٹ مار ہو گا۔ اگر ہم نے ایک بار ان کے دانت کھٹے کر دیئے تو وہ دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

شیر علی نے کہا: لیکن بخوردار! اتنے بڑے کام کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیئے۔ تمہارے خیال میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنا وقت لگے گا؟

اگرچہ پچاس ساٹھ آدمی روز کا کام پر لگا دیتے جائیں تو یہ کام چند دن میں ختم ہو سکتا ہے لیکن

پرستی سے مرزا صاحب کو میری بہت سی تجاویز سے اتفاق نہیں۔  
حسین بیگ نے شیرعلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: مجھے منظرہ کسی تجویز سے اختلاف نہیں لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت دقت چاہیے۔ اور پھر اگر ہمارا یہ دم غلط ثابت ہوا کہ مرہٹوں کی فوج محاذ جنگ چھوڑ کر اس طرف آنکلی گی تو شہر کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔ اور وہ تو چھوڑتے میرے اپنے بیٹے واپس آکر یہ کہیں گے کہ باباجان آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ اب یہی یہ حالت ہے کہ مرشدآباد میں میرے بعض دوست میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہیں۔

شیرعلی نے کہا: مرزا صاحب! لوگوں کی نکتہ حسنی کی پروا نہ کیجیے۔ خدا کرے کہ مرشدآباد کے متعلق ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹے اگر میدان جنگ سے شکست کھا کر واپس بھی چلے گئے تو ہمیں مستقبل میں کوئی اور خطرہ پیش نہیں آسکتا، موجودہ دور میں ہمیں برزقت غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے تیار رہنا چاہیے۔ عقلمند لوگ ہمیشہ بارش سے پہلے اپنے مکانوں کی چھتیں مرمت کرتے ہیں اور موجودہ زمانے میں بارش سے زیادہ دشمن کے حملے کے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ بعض گھٹائیں برسات کے موسم میں بھی برے بغیر گزر جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ جو لوگ بارش کے آثار دیکھتے ہی اپنی چھتوں اور پرانوں کی مرمت کا کام شروع کر دیتے ہیں وہ احمق ہیں۔

حسین بیگ نے کہا: مجھے میں میرے متعلق یہ بات بھی مشہور ہو چکی ہے کہ میرے پاس براخراہ ہے اور میں یہ سب کچھ اس کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔

شیرعلی نے کہا: مرزا صاحب آپ اپنا کام جاری رکھیے۔ اگر آپ کے پاس خزانہ نہیں تو شاید کسی دن خزانوں والے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔ جگت سیٹھ اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے بہت فخر مند ہے۔ اب تک وہ اپنے محل کو دفاعی لحاظ مضبوط بنانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہے۔ مجھے اس نے اپنے محل کا محافظ مقرر کیا ہے لیکن اب

میں نے جو کچھ کیا ہے وہ معظم علی کی اس کارگزاری کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ معظم علی نے اس محلے کے لوگوں میں جو مدافعتانہ جذبہ بیدار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ لیکن جگت سیٹھ نے جو کرائے کے سپاہی بھرتی کیے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ خطرے کے وقت وہ شاید اپنی ہندوؤں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں۔

وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رہائشی مکان کی دوسری طرف بندوق پٹنے کی آواز سنائی دی۔ شیرعلی نے چونک کر کہا: یہ بندوق کی آواز شاید اندر سے آئی ہے۔

حسین بیگ مسکرایا: یہ افضل کی بہن ہوگی۔ وہ بالائی منزل کے درپچے سے بندوق چلانے کی مشق کیا کرتی ہے۔

تھوڑی دیر اور باتیں کرنے کے بعد شیرعلی نے حسین بیگ سے رخصت چاہی۔ معظم علی اسے ڈیڑھ گھنٹہ تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ دروازے پر پہنچ کر شیرعلی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "معظم آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد مجھے اس بات کا احترام کرنا پڑتا ہے کہ کئی سال فوج میں ملازمت کرنے کے بعد بھی تمہارے مقابلے میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی دن تھوڑی دیر کے لیے جگت سیٹھ کے محل میں آکر میرے انتظامات کا جائزہ لو۔ یقیناً تم مجھے کوئی کارآمد مشورے دے سکو گے؟"

"آپ جس وقت حکم دیں، میں حاضر ہوں۔"

"اگر فرصت ملے تو آج ہی کسی وقت آجاؤ!"

"بہت اچھا، میں آج ظہر کی نماز کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔"



چند دن بعد حسین بیگ کے محل کے بڑی احاطے اور فیصل کے دفاعی انتظامات مکمل ہو گئے تو معظم علی نے اندرونی پار دیواری کے ساتھ خندق کھودنے کو کہا۔

حسین بیگ نے جواب دیا: جو کچھ ہم کر چکے ہیں کافی ہے۔ ہمیں اس گھر کا علیہ اس قدر



نہیں بگاڑنا چاہیے کہ سارا مکان گرا کر از سر نو تعمیر کرنا پڑے۔  
 ”بہت اچھا چچا جان! جیسے آپ کی مرضی۔ اتنی تیاری سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم دشمن کو چند گھنٹوں کے لیے روک سکیں گے۔“  
 معظّم علی یہ کہہ کر دہلی سے چلا آیا لیکن حسین بیگ کے کانوں میں اس کے الفاظ دیر تک گونجتے رہے وہ سارا دن بے چین رہا اور رات کے وقت بھی اسے اچھی طرح نیند نہ آئی۔  
 اگلے دن علی الصباح معظّم علی اپنے گھر میں گرمی نیند سو رہا تھا کہ صابرنے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔ ”سرکار! مرزا صاحب باہر کھڑے ہیں۔“  
 ”مرزا حسین بیگ؟“ معظّم علی نے حیران ہو کر کہا۔  
 ”ہاں سرکار۔ شاید وہ کہیں جا رہے ہیں۔“  
 معظّم علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا باہر نکلا۔  
 ”آپ! اس وقت؟“ اس نے حسین بیگ کو دیکھتے ہی کہا۔  
 ”دیکھو بیٹا!“ حسین بیگ نے کسی تہمید کے بغیر کہا: ”کل تم سے باتیں کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو خندق بھی کھود دی جائے۔ لیکن وہ بس اتنی گرمی ہو کہ دشمن اندرونی دیوار پھاندنے کے بعد آسانی سے مکان پر حملہ کر سکے۔ لیکن تم یہ وعدہ کر دو کہ اس کے بعد خندق کے آگے بانس گاڑنے کی تجویز پر زور نہیں دو گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مرشد آباد کے لوگ مجھے سچ پانچ پاگل سمجھنے لگ جائیں۔“  
 معظّم علی جانتا تھا کہ ایک کام ختم ہونے کے بعد وہ خود بخود دوسرا کام شروع کر دے گا۔  
 ”تاہم اس نے کہا۔“ چچا جان میں تو خندق کے لیے بھی آپ کو مجبور نہیں کرتا۔“  
 ”نہیں نہیں خندق ضرور کھودی جائے گی۔ میں اس کا فیصلہ کر چکا ہوں لوگ بھوکتے رہیں مجھے ان کی پروا نہیں۔“  
 ”بہت اچھا چچا جان۔ لیکن آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں دیہات سے آدی بلانے کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ شہر کے لوگ بیکار ہیں۔ یہ کام کرنے کی بجائے میرا مذاق اڑائیں گے۔ دوپہر تک میرے علاقے کے ڈیڑھ دو سوکان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد اگر زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دریا پار کی جاگیر کے کسانوں کو بھی بلواؤں گا لیکن یہ کام چار دن کے اندر ختم ہو جانا چاہیے۔“ حسین بیگ نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔

تیسرے پہر حسین بیگ کے مکان میں خندق کی کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ اور اس کے نگر خانے میں کوئی دو سو آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا تھا۔  
 اگلے دن حسین بیگ کا ایک دوست اس کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: ”مرزا صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟“

مرزا صاحب سے پہلے بھی کئی آدمی یہ سوال کر چکے تھے۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔  
 ”دیکھیے صاحب یہ میرا اپنا مکان ہے۔ اگر میں اسے کھود کر ایک تالاب بنوا دوں تو بھی آپ کو یہ پوچھنے کا حق نہیں۔“

دوست نے دوبارہ اس موضوع پر زبان کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کی جب وہ چلا گیا تو حسین بیگ نے ایک نوکر سے کہا: ”دیکھو آئندہ جو لوگ مجھ سے ملنے آئیں انہیں لانے کی بجائے باہر کی بیٹھک میں روک لیا کرو!“

چند دن بعد خندق تیار ہو گئی اور حسین بیگ نے حویلی سے بارش کا پانی خارج کرنے والی نالیوں کا رخ اس طرف پھیر دیا۔ اس کے بعد اگلے دن محلّے کے لوگوں نے دیکھا کہ حسین بیگ کی حویلی میں بانسوں سے لدے چھکڑے پتلے آ رہے ہیں وہ حیران تھے۔ لیکن کسی کو حسین بیگ کے سلسلے اپنی حیرانی کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔

اس دوران میں معظّم علی بلاناغہ محلّے کے رضا کاروں کو تربیت دیتا رہا۔ بین ابستادی

جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور رضا کاروں کی تعداد بڑھنے کی بجائے روز بروز کم ہو رہی تھی تاہم اسے اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ محلے کے اکثر لوگوں کو بندوق چلانا سکھا چکا ہے۔ اب وہ لوگ بھی جو بظاہر اس کا مذاق اٹایا کرتے تھے۔ درپردہ اپنے اپنے گھروں کی حفاظت کے انتظام کر رہے تھے۔ معظم علی کی تحریک کے اثرات مرشد آباد کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکے تھے اور نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شہریوں میں ماضیانہ شعور بیدار کرنے کے لیے میدان میں آچکی تھی۔



ایک دن معظم علی نے محلے کے تمام رضا کاروں کو حسین بیگ کے مکان میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ بھائیو! اور بزرگو! چند ہفتے قبل مرشد آباد سے فوج کی روانگی کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اگر خدا خواستہ مرشد آباد کو کوئی خطرہ پیش آیا تو شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہمارا محاذ انتہائی غیر محفوظ ہوگا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاہی محل کے بعد ہمارا معاملہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ اب اگر کسی نے ہم پر حملہ کیا تو وہ ہمیں بیٹروں کی طرح نہیں ہانک سکے گا۔ پہلے تو ہم دشمن کو گلیوں کے دروازوں سے باہر روکیں گے۔ پھر اگر وہ ہمارے ابتدائی مورچے توڑ کر اندر گھس آیا تو ہم اپنے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے گولیاں برسائیں گے۔ اس کے بعد اگر ہمیں اور پیچھے ہٹنا پڑا تو یہ حویلی ہمارے لیے آخری حصار ثابت ہوگی۔ خطرے کے وقت محلے کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پناہ مل سکے گی اور ہم اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھ کر ان کی حفاظت کر سکیں گے۔ آپ اس حویلی کے اندر اور باہر اپنا مورچہ دیکھ چکے ہیں۔ اب وہ لاکھ عمل سن لیں جس کے مطابق ہمیں کام کرنا ہوگا۔ خطرے کے وقت سب سے پہلے محلے کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر پہرہ دینے والے رضا کار نکالے جائیں گے۔ اس وقت آپ کو چاہیے کہ آپ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو ابھی سے یہ سمجھا دیں کہ وہ کسی بدحواسی کا مظاہرہ نہ کریں اور نقارے کی

آواز سنتے ہی اس حویلی کے رہائشی مکان میں جمع ہو جائیں۔ یہاں اتنی جگہ ہے کہ محلے کی تمام عورتیں اور بچے سما سکیں۔ نقارے کی آواز کے سنوڑی دیر بعد حویلی کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ آج دوپہر کے بعد ہم اس کی مشق بھی کر لیں گے۔

شام سے قبل کسی وقت نقارے سے بجاتے جائیں گے اور ہم یہ دیکھیں گے کہ کسی غیر متوقع صورت حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں۔ دن کے وقت عورتیں اور بچے اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ لیں گے۔ اور اس کے بعد رات کو کسی وقت یہ مشق دوبارہ کی جائے گی۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے اٹھ کر سوال کیا: آپ کا مطلب ہے کہ رات کے وقت بھی ہمارے بال بچوں کو اٹھ کر اس طرف بھاگنا پڑے گا؟

معظم علی نے جواب دیا: "ہاں لیکن رات کے اندھیرے میں وہ بھاگ نہیں سکیں گے انہیں تاریک گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچنا ہوگا۔ حویلی کے اندر صرف چند منٹ کے لیے مشطیں جلائی جائیں گی تاکہ وہ اپنی اپنی جگہ پناہ دیکھ سکیں۔"

ایک اور آدمی نے اٹھ کر کہا: لیکن یہ تو عجیب بات ہوگی۔ عورتیں اور بچے رات کے وقت یہاں کیسے پہنچیں گے؟

تیسرا بولا: "ہم آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن رات کے وقت عورتوں اور بچوں کا یہ تماشا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ دشمن صرف دن کے وقت حملہ کرے گا تو میں اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ تکلیف دینا گوارا نہ کرتا۔ لیکن موجودہ حالات میں میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ رات کے وقت اگر موسلا دھار بارش جو رہی ہو تو بھی ہمیں یہ مشق ضرور کرنی چاہیے میں جانتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیش لوگ روز آؤں سے ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ چند برس میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہر کئی بار لٹ چکے ہیں اور عافیت پسند لوگ نے وہ مصائب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔"



مرہٹے بھاگ گئے۔ کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

اس نے ایک رضا کار کو گردن سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "تمہیں فحش سے اترنے کی اجازت کس نے دی۔ جاؤ اپنے مورچے میں!"

نوجوان مرعوب سا ہو کر دوبارہ لکڑی کی میٹھی سے فحش پر چڑھ گیا۔ دوسرے رضا کار تذبذب کی حالت میں کھڑے تھے۔ معظم علی غضب ناک ہو کر چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ اپنے مورچوں میں!"

وہ بادل ناخواستہ دوبارہ اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ لیکن ان کے آگے باقی ساری فحش کے مورچے خالی ہو چکے تھے اور دروازے کی سمت لوگوں کے نعرے برآں بلند ہو رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ ڈیوڑھی کے سامنے لوگوں کا جھوم تھا۔ معظم علی کو دیکھ کر ایک رضا کار نے بلند آواز میں کہا: "مباری فوج کو فتح ہوئی ہے۔ مرہٹے اب اس طرف نہیں آئیں گے۔ اب آپ کو اس محلے کی ضرورت نہیں کرنی چاہیے۔"

معظم علی نے کہا: "اگر فتح کی خبر سننے کے بعد تمہاری افزائش کی یہ حالت ہے تو مجھے اب زیادہ فکر مند ہونا چاہیے۔ فتح کی خبر کون لایا ہے؟"

رضا کار نے جواب دیا: "اشرف خاں شاہی محل سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا۔ ہم گلی کا دروازہ بند کر چکے تھے کہ وہ پہنچا۔"

"اور تمہارے دروازہ کھول دیا؟"

"ہاں۔"

"لیکن میری ہدایت تھی کہ جب تک دوسرا نقارہ نہ بجایا جائے۔ گلیوں کے دروازے نہ کھولے جائیں۔"

"لیکن وہ فتح کی خبر لے کر آیا تھا۔"

معظم علی نے کہا: "تو جیسے امن کبھی کبھی بڑی سے بڑی فتح کو شکست میں بدل دیتے

ہیں۔ اگر مجھے وہ اختیارات ہوتے جو فوج کے ایک افسر کو اپنے ماتحت سپاہی پر ہوتے تو میں تمہیں بدترین سزا دیتا۔"

دوسرے رضا کار نے کہا: "لیکن جناب اب تو کوئی بھی اپنے مورچے پر نہیں۔ گلیوں کے تمام پیر میڈر ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہیں۔"

معظم علی لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔ چند بچے اور عورتیں جن کے لیے اندر یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ڈیوڑھی کی دیواروں کے ساتھ جمی ہوئی تھیں۔ باہر اشراف خاں کے گرد لوگوں کا جھوم تھا اور وہ ان کے سامنے جنگ کی ایسی تفصیلات بیان کر رہا تھا جن کا واقعات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ شاہی محل کے ایک سپاہی نے صرف یہ سنا تھا کہ مرہٹے پسپا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ بنگال کی افواج میدان میں دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگانے کے بعد سرحد کے پار ان کا تعاقب کر رہی ہیں۔

چند عورتیں یہاں بھی جھوم کے درمیان پھنسی ہوئی تھیں اور بچے بلبل رہے تھے۔ معظم علی نے لوگوں کو ملامت کی اور وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

اشرف خاں، معظم علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اس نے کہا: "جناب آپ فتح کی خبر سن چکے ہیں؟"

"میں سن چکا ہوں۔ اور اب میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ہٹ جائیے چند خواتین ڈیوڑھی کے اندر پھنسی ہوئی ہیں۔"

معظم علی یہ کہہ کر واپس مڑا اور اس نے حسین بیگ کے ایک نوکر کو ابھی تک ڈیوڑھی کی چھت پر اپنے مورچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نقارہ بجانے کے لیے کہا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے ہنستے ہوئے کہا: "اب نقارہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو یوں بھی سب لوگ چھٹی کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی صحن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جھوم تھا۔ معظم علی

بندھے ہوئے تھے گھوڑوں کی کھڑکیوں کے اوپر دیوار میں لگی ہوئی کھونٹیوں کے ساتھ گھوڑوں کی لگائیں اور زینیں ٹنچی ہوئی تھیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق گھوڑے تیار کرنے کے بعد معظم علی کے ساتھیوں نے باقی تمام گھوڑے کھول کر ڈیڑھ سی کے سامنے جمع کیے پھر حویلی کا پھاٹک کھل دیا گیا اور وہ گھوڑوں کا ریوڑ ہانکتے ہوئے باہر نکل آئے۔

گھوڑوں کی ٹاپ سن کر گاؤں کے پیریار بھاگتے ہوئے اس تنگ گلی میں داخل ہوئے لیکن وہ گھوڑوں کے سموں تلے پس کردہ گئے۔

چند منٹ بعد جب ساتھ دالی حویلی کے محافظ بند و تیں چلا کر اور نقارے بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ معظم علی اور اس کے ساتھی گاؤں سے باہر سرٹ فوج کا پڑاؤ عبور کر رہے تھے اور پیریار جب پڑاؤ کے سپاہی اپنے خیموں سے باہر نکل کر انتہائی پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ دو تین میل آگے جا چکے تھے۔

مرلی دت حویلی میں شور سن کر گہری نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے لیٹے اپنے سپاہیوں کو آوازیں دینے لگا۔ سپاہی بھاگ کر اس کی چھو لہاری میں داخل ہوئے تو اس نے پوچھا کیا ہوا؟

”کچھ نہیں جناب!“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”ساتھ دالی حویلی سے گھوڑے کھل کر باہر نکل گئے ہیں۔“

”گھوڑے باہر کیسے نکل گئے؟“ اس نے برہم ہو کر سوال کیا۔

”پتا نہیں کیسے نکل گئے جناب! حویلی کا دروازہ کھلا ہے اور پیریار کہیں غائب ہیں“ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھوڑوں کو روکنے کے لیے ان کے پیچھے گئے ہیں۔“

”کتے گھوڑے بھاگ گئے ہیں؟“

”جناب تمام نکل گئے ہیں وہاں ایک بھی نہیں رہا۔“

مرلی دت بستر سے اٹھا اور سپاہیوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکل کر بولا۔ ”تم پاگل ہو تمام گھوڑے خود بخود کیسے بھاگ گئے ہیں۔“

پھر وہ بھاگتا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈیڑھ سی کے سامنے اسے مشعل کی روشنی میں چوکی کا محافظ دکھائی دیا۔

”کیا ہوا جناب؟“ اس نے پوچھتے ہوئے سوال کیا۔ ”گھوڑے خود بخود کیسے نکل گئے؟“

”گھوڑے ڈاکو لے گئے ہیں۔“

”لیکن پیریار کہاں گئے تھے؟“

”پیریاروں کو ہم نے ایک کوٹھڑی سے نکالا ہے۔ تم اپنے قیدیوں کا خیال رکھو!“

”جناب قیدیوں کی آپ فکر نہ کریں۔ لیکن اتنے گھوڑوں کا نقصان!“

مرلی دت کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے دو سپاہیوں کے گم ہو جانے کی اطلاع دی۔

مرلی دت نے سوال کیا۔ ”تم نے قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھی ہیں؟“

”ہاں جناب! وہ تو بند ہیں اور ان میں تلسے لگے ہوئے ہیں۔“

ایک دوسرا سپاہی بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی۔ ”جناب قیدی اندر سے کوئی آواز نہیں دیتے بھے ڈر رہے کہ وہ پیچھے کی دیوار میں نقب لگا کر دوسری حویلی میں نہ چلے گئے ہوں۔“

مرلی دت نے برہم ہو کر کہا۔ ”قیدی ناخنوں سے ڈریٹھ گز چوڑی دیوار نہیں کھود سکتے

وہ صرف ہماری پریشانی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔“

چوکی کے محافظ نے کہا۔ ”میں قیدیوں کی کوٹھڑیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد مرلی دت مشعل کی روشنی میں اپنا صندوق خالی دیکھنے کے بعد چلا چلا کر اکبر خاں کو آوازیں دے رہا تھا اور چوکی کا محافظ چند افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

ایک اور پیریار بھاگتا ہوا چھو لہاری میں داخل ہوا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”سرکار غضب



انہیں دیکھ کر روٹ آیا اور دروازے کے پاس ہی چھپرے کے نیچے پڑی ہوئی ایک کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حسین بیگ کا ایک نوکر باہر نکلا اور معظم علی نے اس سے پوچھا: ”مرزا صاحب کہاں ہیں؟“

”وہ اس وقت کتب خانے میں ہیں۔“

”اچھا اب تم خواتین سے کہو کہ ان کے لیے راستہ خالی ہو چکا ہے۔“

”بہت اچھا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو بندوقیں اسلحہ خانے سے تقسیم کی گئی تھیں ان کے متعلق کیا ہدایت ہے؟“

”معظم علی نے کہا: ابھی انہیں رضا کاروں کے پاس رہنے دو۔“



تھوڑی دیر بعد محلے کے ہر گھر میں مرزا حسین بیگ کے متعلق اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ”مرزا حسین بیگ کو کسی بخومی نے بنایا تھا۔ مرہٹے تھارے محل پر حملہ کریں گے۔“ اس نے خواب دیکھا تھا کہ ڈاکو اس کے گھر میں گھس گئے ہیں۔ حسین بیگ ایک سیدھا سادہ آدمی ہے۔ اور محمود علی کے لڑکے نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔“

رات کے وقت فتح کی خوشی میں محلے کی ہر گلی میں چراغ جلانے جارہے تھے۔ جلگت سیٹھ کے محل میں آتش بازی چلائی جا رہی تھی۔ حسین بیگ کے محل میں بھی چراغاں ہو رہا تھا۔ بازاروں اور گلیوں میں چل پھل تھی۔ معظم علی عشاء کی نماز کے بعد اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا گذشتہ چند دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ جمال خاں نیچے صحن میں اپنی کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک معظم علی کو گلی میں شور مچائی دیا اور اس نے اوپر سے آواز دی:۔

”صابر! صابر!“

جمال خاں نے جواب دیا: ”جی صابر ابھی باہر گیا ہے۔“

”معظم علی نے کہا: اچھا تم جا کر دیکھو باہر کیا ہو رہا ہے؟“

جمال خاں بھاگ کر باہر نکلا۔ لیکن چند منٹ تک وہ واپس نہ آیا تو معظم علی نیچے اتر آیا جب وہ باہر نکلا تو جمال خاں اور صابر واپس آتے دکھائی دیے۔

”معظم علی نے کہا: بہت دیر لگائی تم نے کیا بات تھی؟“

جمال خاں نے جواب دیا: ”جی کچھ نہیں محلے کے چند لڑکے صابر کے ساتھ لڑ رہے تھے،

میں پہنچا تو وہ بھاگ گئے۔“

”کیا بات تھی صابر؟“

صابر نے جواب دیا: ”جی وہ آپ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب کے

متعلق بھی بہت داہیات باتیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ نے لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا اور مرزا

صاحب کے ساتھ کسی بخومی نے مذاق کیا تھا۔ ان باتوں پر مجھے غصہ آگیا۔“

”میں جانتا ہوں جو کچھ انہوں نے کہا ہوگا۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“

”جی نہیں ذرا کمیر پھوٹ گئی ہے۔ لیکن میں نے ددڑ کوں کو خوب پیٹا ہے۔“

”بہت بُرا کیا تم نے۔ بڑوں کو بچوں کے ساتھ نہیں لڑنا چاہیے!“

”جناب وہ بچے کہاں تھے، ایک تو مجھ سے بھی آدھ بالشت اونچا تھا۔“

”اچھا اب آرام کرو اور آئندہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو تمہیں لڑنے کی ضرورت نہیں۔“

## تیسرا باب

اگلے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ معظم علی صبح کا ناشتہ کھا کر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے قریب حسین بیگ کا نوکر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ مرزا صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔

معظم علی محل میں پہنچا، حسین بیگ دیوان خانے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی کہا: ”آؤ بیٹا میں ابھی شاہی محل کے ناظم اور مرشد آباد کے فوجدار سے مل کر آیا ہوں۔ فوج کی خبر درست ہے۔ ہماری افواج نے کٹوے پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ مرہٹوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے کٹوے اور اس پاس کی بستیوں میں خوراک کے تمام ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور فوج کا سامان رسد بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج مرشد آباد سے الماج بھیجا جا رہا ہے۔ مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد کٹوے سے چند میل پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ لیکن ابھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واپس چلے جائیں گے یا کوئی اور محاذ تلاش کریں گے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ مرشد آباد کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ تمہیں محلے کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ گھر دہلی میں بیٹھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لوگ بکتے رہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں فوج کے واپس آجانے پر بھی اپنی جوبی کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کا کام جاری رکھوں گا۔ برسات کے بعد میری تفصیل کی مرمت کی جائے گی اور اندرونی دیوار کو گرا کر از سر نو تعمیر کیا جائے گا۔ اور یہ سارا کام تمہاری مرضی کے مطابق

ہوگا۔“

معظم علی نے کہا: ”چچا جان میں لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہیں ہوں اور میرے نزدیک مرشد آباد کا خطرہ کم نہیں ہوا۔ کٹوے سے فرار ہونے کے بعد مرہٹے یہ سوچ رہے ہوں گے کہ بنگال کا کون سا شہر ایسا ہے جس پر وہ آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں اور جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ مل غنیمت مل سکتا ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب ان کا ہدف میڈنا پور یا کنگ ہوگا یا مدھن آباد کا رخ کریں گے۔ ان کے لیے مرشد آباد پہنچنا نسبتاً مشکل ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے مرشد آباد کی دولت کا دوسرے شہروں سے مقابلہ کیا تو وہ مشکلات کی پروا نہیں کریں گے۔“

حسین بیگ نے کہا: ”مرشد آباد کی دفاعی حالت اتنی کمزور نہیں۔ فوج اگرچہ یہاں کافی نہیں لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ بندوقی حملہ آور کو ایک دو دن بھی روک نہ سکے۔ پھر علی دردی خاں اتنا نادان نہیں کہ وہ مرشد آباد کو خطرے میں دیکھ کر کٹوے میں بیٹھا رہے۔ اگر مرہٹوں نے اس طرف کا رخ کیا تو علی دردی خاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ جائے گا۔“

معظم علی نے کہا: ”اور یہی بات ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ دشمن کو اگر مرشد آباد کا رخ کرنے میں کسی فائدے کی امید نہ ہو تو بھی وہ صرف علی دردی خاں کی توجہ دوسرے محاذ پر مبذول کرنے کے لیے چند دتے مرشد آباد کی طرف روانہ کر سکتا ہے۔ دارالحکومت کو خطرے میں دیکھ کر علی دردی خاں ایک لمحہ کے لیے بھی کٹوے میں ٹھہرنا گوارا نہیں کریں گے۔ بیشک ان کے یہاں پہنچ جانے سے مرہٹوں کا بھاگ جانا یقینی ہے۔ لیکن مرہٹوں کی باقی فوج کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر میڈنا پور پر قبضہ کر لے گی اور اس کے بعد بر دوان کا سارا علاقہ خطرے میں پڑ جائے گا۔“

حسین بیگ نے دل برداشتہ ہو کر کہا: ”تو پھر علی دردی خاں کو کیا کرنا چاہیے؟ تمہارا خیال ہے کہ اگر مرہٹوں کا کوئی لشکر مرشد آباد پہنچ جائے تو اسے ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہیے؟“

”نہیں چچا جان، میں یہ سمجھتا ہوں کہ علی دردی خاں کے سالاروں نے اسے صحیح مشورہ



کے جائیں تو یہ مشکل نہیں۔ ہم میر حبیب سے تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔ میر حبیب نے ہمارے ساتھ صلح کی درخواست کی ہے اور ہم صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے میر جعفر کی سرکردگی میں ایک وفد اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔

معظم علی نے بوجہ اس جو کہ سوال کیا: آپ میر حبیب سے صلح کرنا چاہتے ہیں؟  
ہاں! ہم اڑیسہ پر مرہٹوں کے پلے درپے حملوں سے تنگ آچکے ہیں۔ میر حبیب بعض شرائط پر اڑیسہ کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہے اس کے لٹپی دوبار ہمارے پاس آچکے ہیں۔ میر جعفر کا خیال ہے کہ وہ ہماری ملازمت اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اگر میر جعفر نے اسے رام کر لیا تو ہم اسے بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔ مرہٹوں کے ساتھ پنشن کے لیے اس سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تم نہایت دقت پر آتے ہو اور میری خواہش ہے کہ اس کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے تمہیں بھی میر جعفر کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔

معظم علی کچھ دیر حیرت و استعجاب کے عالم میں علی دردی خاں کی طرف دیکھتا رہا۔ بلاخضر اس نے کلمہ عالیجاہ! اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں! "کہو!"

"میر حبیب جیسے لوگوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہمیں تو ادا کی زبان کی ضرورت ہے۔ میں بیٹھریں سے بیٹھریں کی حفاظت کا کام لینے کی منطق کا قائل نہیں۔ میں میر حبیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک فدا رہے اور ایک فدا پر دوبارہ اعتماد کرنا پرلے درجے کی خود فریبی ہوگی۔ اگر وہ صرف آپ کا دشمن ہوتا تو آپ اس کا ماضی فراموش کرنے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن وہ آپ کی حکومت سے زیادہ بنگال کے باشندوں کی عزت و آزادی اور بنگال کا دشمن ہے اور بنگال کا دشمن وطن اس کا ماضی فراموش کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ میں آپ کی فوج میں اس لیے شامل ہوا تھا کہ میں اپنے دل میں بنگال کی عزت اور آزادی

کے لیے ایک تڑپ محسوس کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے آپ کا پرچم بلند رکھنے کے لیے پیش کیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آپ کے دشمنوں کو بنگال کا دشمن اور بنگال کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اگر آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو ایسے لوگوں کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑے گا جو اپنے خون کی روشنائی سے قوم کی آزادی کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔" علی دردی خاں نے کہا: کاش قوم میں تمہارے جیسے چند اور نوجوان ہوتے۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں ہماری مجبوریوں کا علم نہیں۔ میں بیک وقت ان ان گنت طالع آزمائوں کے ساتھ کیسے منٹ سکتا ہوں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حکومت کی مسند کا واحد حقدار سمجھتا ہے۔ موجودہ حالات میں میر حبیب کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھانا میرے لیے ایک مجبوری ہے۔

معظم علی نے جواب دیا: آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ حکومت کا کاروبار چلانے یا ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند طالع آزمائوں کے درمیان توازن قائم رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان جاہ پسندوں میں سے کسی کو بھی قوم کی عزت اور آزادی کا امین نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ قوم کی اجتماعی قوت مدافعت ہی ہماری بقا اور آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ یہ ابن الوقت، یہ غدار اور یہ اقتدار کی مسندوں کے لیے بے حیا و عریار، عوام کی بے حسی، بددلی اور مایوسی کی پیداوار ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ سودا کرنے کی بجائے آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیلار کریں۔ یہ وہ ناسور ہیں۔ جنہیں کاٹ کر جڑ سے نکلانے بغیر ایک صحت مند قوم کی تخلیق ممکن نہیں۔ اور جو حکومت ایک صحت مند قوم کی تخلیق سے قاصر رہتی ہے اس کے لیے گھر کے غدار بیردنی حملہ آوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں؟

علی دردی خاں نے قدرے تلخ ہو کر کہا: نوجوان تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ میر حبیب کے خلاف تمہارے غم و غصہ کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں لیکن موجودہ حالات میں

دیا تو اس فتح کے بعد مرہٹوں کو کسی اور محاذ کا رخ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ میرے خیال میں یہی چند دن ایسے ہیں جب مرہٹوں پر ضرب کاری لگائی جاسکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: اچھا بتاؤ اگر تم علی دردی خان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

معظم علی مسکرایا اور اس نے قد سے توقع کے بعد کہا: میں اگر ان کی جگہ ہوتا۔ تو اس فتح کے بعد ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ان کا تعاقب جاری رکھتا۔ میں کٹھن میں پڑاؤ ڈال کر مرشد آباد اور دوسرے شہروں سے سامان رسد کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بھوکے سپاہیوں سے یہ کہتا کہ

ہمارے پاس رسد کی کمی ہے۔ لیکن ہم مرہٹوں سے اناج کے وہ ذخیرے چھین سکتے ہیں جو انھوں نے اس علاقے کو لوٹ کر جمع کیے ہیں۔ اس صورت میں مرہٹوں کے سامنے صرف اپنی جانیں بچانے کا مسد ہوتا۔ مرہٹے کسی مشنم فوج کے سپاہی نہیں صرف لیڑے ہیں۔ ان کی مدد

تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک محاذ سے نقصان اٹھانے کے بعد جوابی حملہ کے لیے ہمیشہ کوئی نیا محاذ تلاش کرتے ہیں۔ اور اگر ان کا مد مقابل چوکس ہو تو وہ تیاری کا موقع حاصل کرنے کے لیے صلح کی بات چیت شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان پر طغیاری کا دقت ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس دقت

کٹھن میں فتح کا جشن منایا جا رہا ہوگا۔ انعامات اور خلعتیں تقسیم ہو رہی ہوں گی۔ اور مرہٹے چند میل دور اپنے پڑاؤ میں کسی نئے محاذ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ پھر رسد کا سامان پہنچے گا۔ سپاہی اور افسر چند دن خوشیاں منائیں گے۔ پھر جنگ کی تیاری ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ پنڈت بھاسکر نے صلح کی بات چیت شروع کر دی ہو اور جس دن یہ بات چیت ختم ہو۔

علی دردی خان کو یہ اطلاع ملے کہ مرہٹوں کی فوج کا ایک حصہ کٹھن سے پچاس یا سو کوس دور بھاگ کسی اور علاقے یا شہر میں لوٹ مار شروع کر چکا ہے۔ مجھے علی دردی خان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ لیکن میں ایک حکمران کی سیاسی مصلحتوں سے ڈرتا ہوں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو آج

بنگال کی فوجیں کٹھن سے کوسوں دور مرہٹوں کا تعاقب کر رہی ہوتیں۔ ان کے رسد اور بارود کے محاذ سارا دن کی توہیں ہمارے قبضے میں ہوتیں پنڈت بھاسکر اگر صلح کے لیے اچھی بھیجتا تو میں

یہ جواب دیتا کہ صلح کی بات چیت صرف بنگال کی سرحدوں سے باہر ہو سکتی ہے۔

حسین بیگ نے کہا: لیکن میردن، علی دردی خان کے ساتھ ہے اور تم ہمیشہ یہ کہاتے

ہو کہ وہ ایک حقیقت پسند سپاہی ہے۔

معظم علی نے جواب دیا: وہ یقیناً ہماری فوج کے تمام جرنیلوں سے زیادہ دوراندیش ہیں

لیکن میدان جنگ سے باہر علی دردی کے نزدیک ایسے لوگوں کی اہمیت عام طور پر کم ہو جاتی ہے۔

دبار میں وہ میر جعفر اور دلب رام جیسے خوشامدوں اور جی حضوروں کی باتیں زیادہ غور سے

سننے ہیں۔

حسین بیگ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: ہاں معظم آج صبح چند آدمی بندو قیں

واپس کرنے آئے تھے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہا کہ جب تک فوج واپس نہیں آئی یہ تمھارے

پاس امانت رہیں گی۔ تم بھی یہی چاہتے تھے نا؟

جی ہاں۔

لیکن اب تمھارے رضا کار پریڈ کے لیے آنا تو شاید پسند نہ کریں؟

پریڈ کی اب ضرورت نہیں وہ ابتدائی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب صرف رات کے وقت

محلے میں پہرہ دینے کی ضرورت ہے۔ فتح کی خبر سننے کے بعد ایسی باتوں سے لوگوں کی دلچسپی

ذرا کم ہو گئی ہے۔ لیکن دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سنجیدگی کے ساتھ میری باتیں سننے لگ

جائیں گے۔



شام کے وقت بارش ہو رہی تھی۔ مرشد آباد کے قائم مقام فوجدار کے ہاں شہر کے چند

روسا اور سرکاری عمدہ داروں کی دعوت تھی۔ جب مہمان ایک کشادہ کمرے میں دسترخوان

پر بیٹھ گئے تو کسی نے فوجدار سے مرزا حسین بیگ کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

فوجدار نے جواب دیا: ان کا پیغام آیا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔



ایک شخص نے کہا: "جناب مرزا صاحب! آجکل یوں بھی اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے۔"  
دوسرا بولا: "بھئی جب گھر میں کام ہو تو باہر نکلنے کی کیا ضرورت ہے۔ مرزا صاحب  
آجکل بہت مصروف ہیں۔ آپ ان کی حویلی کے اندر جا کر دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔"  
ایک اور آدمی فوجدار سے مخاطب ہو کر بولا: "جناب اگر آپ مرزا صاحب کو یہ یقین دلاتے  
کہ اب مرشد آباد کو کوئی خطرہ نہیں تو وہ ضرور تشریف لاتے؟"

فوجدار نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے مہمان اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا حسین بیگ  
پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

شہر کے ایک تاجر نے کہا: میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے محلے کے لوگوں کو رات بھر سونے  
نہیں دیتے۔"

مرشد آباد کا کووالا بولا: "مرزا صاحب ایک سیدھے سادے بزرگ ہیں۔ لیکن ان کے  
محلے کا ایک نوجوان ان کے ساتھ دل بٹی کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں ان کے محلے سے گزر رہا تھا۔  
انہیں سے بھرے ہوئے کئی چھکڑے ان کی حویلی کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی  
سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اندر مورچے ہوا رہے ہیں۔"

"بالنس کے مورچے؟" ایک امیر زادے نے کہا: "آپ کے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہوگا؟"  
"جی نہیں آپ مرزا صاحب کی حویلی دیکھیں تو حیران رہ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد حسین بیگ اس محفل کی گفتگو کا واحد موضوع بن چکا تھا۔ اور قریباً ہر شخص اس گفتگو  
میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ فوجدار ایک سنجیدہ آدمی تھا اور اسے یہ باتیں ناگوار محسوس ہو  
رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ لیکن جب مہمان زیادہ بے تکلف ہو کر حسین بیگ کا مذاق اڑانے  
لگے تو اس نے کہا: "مرزا صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس محفل میں انھیں  
موضوع بحث بنایا جائے۔"

ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا: "جناب مرزا صاحب کا ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن ہمارے

سے مورچے تعمیر کرنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بھلا بالنس گولی روک سکتے ہیں؟"  
فوجدار نے جواب دیا: "بالنس گولی نہیں روک سکتے لیکن گولی چلانے والوں کو آگے بڑھنے  
سے روک سکتے ہیں۔ میں نے خود مرزا صاحب کی حویلی کے دفاعی انتظامات دیکھے ہیں۔ اور  
وہاں مجھے کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آتی۔ ان کا محلہ شہر سے باہر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ  
خطرے کے وقت اس محلے کے لوگ شہر کے لوگوں کی نسبت کم محفوظ نہیں ہوں گے۔"  
ایک نوکرتیزی سے قدم اٹھاتا ہوا فوجدار کے قریب پہنچا اور اس نے جھک کر اس  
کے کان میں کچھ کہا۔

فوجدار نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے مہمانوں کی طرف دیکھا اور کہا:  
"آپ اعلیٰان سے کھانا کھائیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

فوجدار کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں ایک فوجی افسر کھڑا تھا۔ اس نے سلام کے  
بعد کہا: "جناب معاف کیجیے میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی ہے لیکن خبر بہت تشویشناک  
ہے۔ مرہٹوں کی ایک فوج یلغار کرنی ہوئی مرشد آباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

فوجدار نے اپنی پریشانی پر قابو پالتے ہوئے کلمیہ خبر کون لایا ہے؟  
"ابھی راستے کی ایک چوکی کا کمانڈر یہاں پہنچا ہے اور وہ یہ کہتا ہے پچھلی چوکیوں کے  
سپاہیوں نے ڈاک گھومروں پر خبر اس تک پہنچائی تھی۔ میں نے تصدیق کے لیے سپاہیوں  
کا ایک دستہ روانہ کر دیا ہے۔"

"اور خبر لانے والا کہاں ہے؟"  
"جی میں اسے محل کے ناظم کے پاس تھپوڑ آیا ہوں۔ وہ ٹھکانا سے نڈھال تھا۔ اس  
نے صبح سے لے کر شام تک لگاؤ سفر کیا ہے اور راستے میں کئی گھوڑے تبدیل کیے ہیں۔ وہ  
کہتا ہے کہ جب میں اپنی چوکی سے روانہ ہوا تھا۔ تو مرہٹے صرف ایک منزل پیچھے تھے۔ اور اب  
یہاں سے شاید دو یا تین منزل دور ہوں گے۔"

”اچھائیں ابھی آنا ہوں۔ تم جا کر شہر میں منادی کروادو!“  
افسر نے سلام کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔  
فوجدار دوبارہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔  
کسی نے سوال کیا: جناب کیا بات تھی؟

فوجدار نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا: کچھ نہیں۔ ایک سرکاری کام تھا۔ آپ اطمینان سے کھانا کھائیں۔“

لیکن مہمان کھانے سے زیادہ فوجدار کے چہرے کے آثارِ چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔  
کھانے سے فارغ ہو کر فوجدار دسترخوان سے اٹھا اور اس نے کہا: سحرات مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن آپ آرام سے باتیں کریں۔ باہر بادشہ کی جہاز ہے۔  
ایک امیر زادے نے سوال کیا: آپ اس بادشہ میں کہاں جا رہے ہیں؟  
فوجدار نے جواب دیا: ایک سپاہی کو بادشہ میں جیلنے کا عادی بننا پڑا ہے۔ مجھے ابھی خبر ملی ہے کہ مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کا رخ کر رہا ہے۔

مجلس پر سناٹا چھا گیا اور حاضرین بدحواس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔  
فوجدار نے کہا: لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ ابھی یہاں سے کئی منزل دور ہیں۔ اگر انھوں نے انتہائی کوشش کی تو بھی کل صبح یا دوپہر سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔  
فوجدار باہر نکل گیا۔

چند ثانیے بعد معزز مہمانوں کی افزائش کا یہ عالم تھا کہ ان کے لیے اپنے جوتے پہنانا بھی مشکل تھا۔ کوئی اپنے جوتوں کی بجائے کسی اور کے جوتے پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی بدحواسی کی حالت میں دائیں پاؤں کے جوتے میں بائیں پاؤں کے جوتے دایاں پاؤں ڈال رہا تھا، پھر مکان سے نکلنے کے بعد ان میں سے اکثر برسوں کے بعد پہلی بار بھاگنے کی مشق کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مرشد آباد کے ہر گلی کوچے میں مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ مرزا حسین بیگ کے محلے کی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان موسلا دھار بارش میں اس کی حویلی کا رخ کر رہے تھے۔ ایک ساعت کے اندر اندر رہائشی مکان کی پختی منزل اور دیوان خانے کے گرد اور بلاموں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بسن لوگ افزائش کے عالم میں بادشہ سے بچنے کے لیے چار دیواری سے باہر نکلے اور چارے کے گودا میں، نوکریں کی کوٹروں اور گھوڑوں کے اھٹیل میں پناہ لے رہے تھے۔

مستظم علی محلے کی گلیوں کے ناکے دیکھنے اور سپرو داروں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پانی اور کھڑے لت پت حویلی میں داخل ہوا۔ ڈیڑھ بجے کے اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں اور حسین بیگ چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔

مستظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: ”فوجدار کی طرف سے کوئی جواب آیا ہے؟“

”ہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ صبح سے پہلے مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطرہ نہیں اور اگر کئی خطرہ پیش آیا تو اہل شہر کو خبردار کرنے کے لیے توہیں چلا دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مرہٹوں کی قیادت میر حبیب کر رہا ہے۔“

مستظم علی نے کہا: ”آپ اندر جا کر آرام کریں۔ میں گلیوں کے تمام ناکے دیکھ آیا ہوں۔ ہمارے انتظامات بہت تسلی بخش ہیں۔“

حسین بیگ نے کہا: ”اگر آج رات اس گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی آرام کر سکے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ عشر کے دن بھی اطمینان کی نیند سو سکے گا۔ ذرا جا کر دیکھو، تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ انسان اتنا شور مچا سکتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ روئے زمین کے تمام ہنگامے میرے گھر کی چار دیواری کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پورے خاندان کو



ایک ہی کوسے کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے مردوں کو عورتوں سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ایک دروازے سے نکلتے ہیں اور دوسرے دروازے سے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ معظم علی نے کہا: چچا جان میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آدھ گھنٹے کے بعد آپ کسی کی آواز نہیں سنیں گے۔ آئیے میرے ساتھ !

حسین بیگ نے کہا: نہیں میں آدھ گھنٹے کے لیے اندر جانے کی بجائے ساری رات یہاں کھڑا رہنا آسان سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اندر جا کر کسی کا گلا گھونٹ دوں گا۔ معظم علی نے ڈیوڑھی میں سج ہونے والے مسخ رضا کاروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

تم دروازہ بند کرو اور میرے ساتھ آؤ!۔  
رضا کاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ معظم علی موسلا دھار بارش میں حویلی کے اندرونی صحن کی طرف بڑھا۔ حسین بیگ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر جھانکنا ہوا ان کے ساتھ جا ملا۔ رہائشی مکان کے برآمدوں اور کمروں میں ایک طوفان خیز رہا تھا۔ حسین بیگ کے نوکر جگہ جگہ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔

معظم علی برآمدے میں داخل ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا: خاموش! خاموش!!  
برآمدے میں اس کے پاس چند لوگ خاموش ہو گئے لیکن مکان کے باقی حصوں میں چیختے جھاتے انسانوں کے جھوم کو اس کی آواز متاثر نہ کر سکی۔

معظم علی نے حسین بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: آپ اوپر جا کر دیکھیں اگر بالائی منزل میں جاگے تو عورتوں اور بچوں کو دباں بھیج دیا جائے۔

حسین بیگ نے جواب دیا: بالائی منزل پر عورتوں اور بچوں کے لیے کافی جگہ ہے لیکن مردوں کی برتیزی دیکھ کر میں نے سیرمی کے دروازے پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ عورتوں اور بچوں کے پسے دباں پہنچنا چاہتے تھے۔

آپ تالا کھول دیں۔ میں انھیں سمجھاؤں گا۔

تم پسے تسلی کر لو درنہ یہ دروازہ کھلتے ہی بیٹروں کے ریوڑ کی طرح اوپر بھاگے کی کوشش کریں گے۔ خدا کے لیے انھیں خاموش کر دو۔ درنہ میں دھکی کسی کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔ یہ ابھی خاموش ہو جائیں گے۔

معظم علی نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے بندوق لی اور صحن کی طرف منہ کر کے ہوا میں فائر کر دیا۔

ایک ثانیہ کے اندر اندر کے ہر گوشے میں سناٹا چھا گیا۔ معظم علی نے لوگوں کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بلند آواز میں کہا:۔

”بھائیو اور بہنو! ابھی دشمن کی میل دور ہے اور صبح تک مرشد آباد پر حملے کا کوئی خطو نہیں۔ ہم نے تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر تمہاری افراتفری کا یہی عالم رہا تو تمہارے محافظوں کے لیے یہ چنچ پکار اور یہ نظمی دشمن کی گولیوں کی نسبت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی میں تمہیں چند ضروری ہدایات دینا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو اس کی حفاظت ہمارے ذمے نہیں ہوگی، ہم اسے اس حویلی سے باہر نکال دیں گے۔ میری ہدایات یہ ہیں:۔ وہ تمام آدمی جن کی عمر پچاس سال سے کم ہے۔ فوراً باہر نکل آئیں انھیں بیردنی صحن کی کونٹھروں میں جگہ دی جائے گی۔ خواتین جن کے ساتھ کم سن بچے ہیں بالائی منزل کے کمروں میں چلی جائیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور عمر رسیدہ یا بیمار لوگ دیوان خانے کے کمروں اور برآمدوں میں پناہ لے سکتے ہیں۔ جن خواتین کو بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہ مل سکے وہ چلی منزل کے باقی کمروں میں رہیں۔

حملے کے وقت جو لوگ لڑنے کے قابل ہوں اور جن کے پاس کوئی ہتھیار ہو وہ رضا کاروں کیساتھ شامل ہو جائیں اور باقی یہاں آجائیں۔ اگر بارش ختم گئی تو وہ اندرونی صحن کے مورچوں میں پناہ لے سکیں گے۔ درنہ برآمدوں اور چلی منزل کے کمروں میں ان کے لیے کافی جگہ ہوگی۔ دس منٹ کے بعد میں مکان کے تمام کمروں کا معائنہ کروں گا۔ اگر مجھے معلوم ہوگا کہ کسی نے جان بوجھ کر

میری دلیات پر نہیں کیا تو اسے کسی اچھے سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تمام مشعلیں بھادی جائیں گی۔ میں آپ کی تسلی کے لیے پھر ایک باریہ اعلان کرتا ہوں کہ صبح تک محلے کا کوئی خطرہ نہیں۔ آپ اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہیں۔ اس وقت ہماری ساری توجہ جوہلی کے دفاعی انتظامات پر صرف ہونی چاہیے۔ اور میں یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ بلاوجہ ہمیں پریشان نہیں کریں گے۔

قریباً پون گھنٹہ کے بعد جوہلی میں مکمل سکون تھا اور معظم علی حسین بیگ سے کہہ رہا تھا "چچا جان! اب آپ اوپر جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں۔"  
حسین بیگ نے جواب دیا: "میتا میں صرف شور سے گھبراتا تھا۔ اب مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔ میں رضا کاروں کے ساتھ باہر کی فسیل پر پہرہ دینا چاہتا ہوں۔"

اگلے دن دس بجے کے قریب میر صیب کی قیادت میں مرہٹوں کا لشکر مرشد آباد کے مضائقہ میں ٹوٹ مار کر رہا تھا۔ حملہ آور فوج کے ایک دستے نے حسین بیگ کے محلے میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گلی کے مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑے ہی بعد چند اور دستے آگئے اور انہوں نے ایک گلی کے نلکے کے آس پاس چند مکانات کی چیتوں پر قبضہ کر کے رضا کاروں کو پیچھے ہٹا دیا اور محلے کے اندر داخل ہو گئے۔ محلے کی گلیاں اور مکانات خالی دیکھنے کے بعد انہوں نے حسین بیگ کی جوہلی کی طرف توجہ کی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اچانک ڈیوڑھی کی چھت اور فسیل کے مورچوں سے گولیاں برسنے لگیں اور وہ گلی میں چند لاشیں چھوڑ کر اس پاس کے مکانات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کے ایک اور دستے نے دوسری طرف سے فسیل کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن جوہلی کے محافظوں نے اسے بھی مار کر پیچھے ہٹا دیا۔

گوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہ آس پاس کے مکانات کی چیتوں پر لیٹ کر گولیاں پھلاتے رہے۔

اتنی دیر میں ان کے کئی اور ساتھی اس محلے میں جمع ہو چکے تھے۔ مرہٹوں نے اچانک مشرقی سمت میں جوہلی کے قریب ایک دو منزلہ مکان کی چھت سے فائر شروع کیے تو اس طرف فسیل کے محافظ ان کی گولیوں کی زد میں تھے۔ چند رضا کار زخمی ہوئے اور باقی بندی سے آنے والی گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے اپنے مورچوں میں دھبک گئے۔ مرہٹوں کے چند دستوں نے اس مورچہ گاہ سے فائدہ اٹھایا اور اچانک گلیوں اور مکانات سے نکل کر فسیل کے اس حصے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے چند آدمیوں نے فسیل کے ساتھ ہالوں کی سیڑھیاں کھڑی کر دیں اور ان کی آنکھیں کوئی پچاس آدمی فسیل پر پہنچ گئے۔ فسیل کے محافظ اس پاس کے مورچوں سے نکل کر اس طرف بڑھے۔ لیکن مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سامنے ان کی پیش نہ گئی چند منٹ دست بردست لڑائی کے بعد مرہٹے فسیل کے مشرقی حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور جوہلی کے محافظ محض میں جمع ہو کر انہیں نیچے اتارنے سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مستم علی ڈیوڑھی کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بیک رضا کار سے کہا "پسپانی کے لیے نقارہ بجا دو۔"

رضا کار نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور بیرونی فسیل کے محافظ نقارے کی آواز سننے ہی اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر اندر دینی محض کے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ مشرقی دیوار کے نیچے لڑنے والے رضا کاروں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر مرہٹے انہیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترا اور آٹھ دس فوجیوں کے ساتھ مرہٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس محلے کی شدت نے مرہٹوں کو چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور رضا کار ایک منظم طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

مرہٹوں نے اپنی فتح یقینی سمجھ کر چند آدمیوں کے پنج نکلنے کو زیادہ اہمیت نہ دی اور انہوں نے آگے بڑھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ قریباً آٹھ سو مرہٹے سیلاب کے ریلے کی طرح بیرونی محض میں داخل ہوئے۔ لیکن اس عرصہ میں اندر دینی اور بیرونی چار دیواری کے درمیان کا وسیع



وہے کے جیشار ٹکڑوں نے دروازے کے سامنے کئی گڑبگ لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس کے بعد حملہ آفرین ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کو ہزاروں خندقوں اور کھائیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر درمیانی دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے سوسے زیادہ آدمی ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ قریباً دو گھنٹہ اور گزر گئے اور حویلی کے محافظوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ٹوٹے ہوئے دروازے کے قریب دیوار کے عقب سے سفید جھنڈا نمودار ہوا۔ اور کسی نے بلند آواز میں کہا:

”ہم صلح کی بات چیت کے لیے ایک آدمی اندر بھیجنا چاہتے ہیں۔“

جب چند ثانیہ اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو کسی نے دوبارہ کہا: ”ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ صلح کی بات چیت کے لیے ہمارا ایک آدمی اندر آ سکتا ہے یا نہیں؟“

معظم علی صحن کے مورچے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھا اور اس نے جواب دیا: ”تم ایک آدمی اندر بھیج سکتے ہو۔“

مرہٹہ فوج کا ایک افسر سفید جھنڈا اٹھائے دروازے کے سامنے نمودار ہوا اور راستے میں بکھری ہوئی لاشوں سے پنج بچ کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر رکھا اور بولا: ”ہمیں تمہاری تیاری کا علم نہ تھا اور ہم نے اپنی غلطی سے اتنا نقصان اٹھایا ہے لیکن تمہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم اتنا نقصان اٹھانے کے بعد خالی ہاتھ واپس چلے جائیں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”ہمیں اس سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی واپس نہ جاسکے۔“

مرہٹہ افسر نے کہا: ”میں اس حویلی کے مالک کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں!“

معظم علی نے جواب دیا: ”اس حویلی کا مالک ڈاکوؤں کے ساتھ بات کرنے کا عادی نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ایک لاکھ روپے کے عوض اپنی جانیں بچا سکتے ہو۔“

احاطہ حویلی کے محافظوں سے خالی ہو چکا تھا۔ مرہٹہ لشکر کا ایک سردار چلایا: ”بہادر! ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیوار پھاڑ کر اندر داخل ہو جاؤ!“

سپاہیوں نے کسی وقت کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن چند ثانیہ بعد وہ اپنے ساتھیوں کو خندق میں گرتا دیکھ کر انتہائی بدحواسی کی حالت میں چلا رہا تھا۔ یہ مکان نہیں قلعہ ہے۔ ہم نے مفت میں اتنی جانیں گنوانی ہیں۔ دروازے کی طرف بڑھو!“

اندر دنی صحن کا دروازہ مرہٹوں کے بے پناہ ہجوم نے ایک ہی دھکے میں توڑ دیا۔ وہ فوج کے نعرے لگاتے ہوئے ایک سیلے کی بیڑ کی طرح آگے بڑھے۔ اندر دنی دروازے اور دائیں مکان کے درمیان کشادہ صحن کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں ایک کھائی بنی۔ جس کے دونوں سرے خندق سے ملے ہوئے تھے۔ اس کھائی کے اندر ساٹھ رضا کار اپنے نو عمر سالہ کی آواز کے منتظر تھے۔ کھائی کے پچھے دو چھوٹے چھوٹے خیموں کے اندر توہین نصب تھیں جن کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

حملہ آور لشکر کا سردار کھائی سے چند قدم کے فاصلے پر دونوں ہاتھ بلند کر کے چلایا: ”لشکر! اور مرہٹوں کا ہجوم رک گیا۔“

مرہٹہ سردار نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر مورچوں سے باہر نکل آؤ، ورنہ ہم ایک آدمی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محلے کے تمام لوگ اس مکان میں جمع ہیں۔ اگر تم اپنی عورتوں کی عزت اور بچوں کی جانیں بچانا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو۔ ورنہ۔۔۔۔۔!“

سالار اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ مکان کی چھت سے بندوق چلنے کی آواز آئی اور وہ لوکھڑا کر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی صحن اور برآمدوں کے مورچوں، مکان کی چھت اور کھڑکیوں سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مرہٹے طیش میں آ کر چند قدم آگے بڑھے اور پھر اٹلے پاؤں دروازہ کا طرف ہٹا گئے۔ اچانک سے بعد دیگرے توپوں کے دو خونخوار دھماکے سنائی دیئے اور

ہوتے ہی ان کے ساتھ چند درخت آئے۔ مغظم علی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ نئے محلے کے لیے رات کی تاریکی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اندرونی دیوار کے پیچھے مرہٹوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس نے خندق کے ساتھ ساتھ ایک چکر لگایا۔ شمالی دیوار کے قریب پہنچ کر اسے کچھ آہٹ سنا دی اور اس نے محسوس کیا کہ مرہٹے دیوار کے پیچھے زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ مشرقی دیوار کے قریب پہنچ کر بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں وہ شمالی اور مشرقی دیوار کے ایک کونے میں ام کے ایک بلند درخت پر چڑھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سینکڑوں آدمی دیوار کے ساتھ ساتھ زمین کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو خبردار کیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی دیواریں گرانے کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر وہ پچھلی منزل میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا، اور انھیں ہدایت کی کہ اب یہاں کسی عورت، بچے یا سیکار آدمی کو نہیں رہنا چاہیے۔ وہ جن کے لیے بالائی منزل کے کمروں میں جگہ نہیں، چھت پر چلے جائیں۔ اگر مرہٹے یہاں تک آگئے تو تم میں سے ہر ایک کو اپنی بہنوں کے ناموس کی خاطر لڑنا پڑے گا۔ تھوڑی دیر بعد رضا کار مشرقی اور شمالی دیوار کے سامنے ریت کی بوریوں کے نئے مورچے بنا رہے تھے۔

کوئی دس بجے کے قریب مرہٹوں نے جنوب اور مغرب کی سمت باہر کے مکانات کی چھتوں سے دوبارہ فائرنگ شروع کی۔ مغظم علی نے بھاگ کر میدان کے اندر اور باہر تمام مورچوں کا چکر لگایا اور رضا کاروں کو یہ حکم دیا کہ دشمن شمال اور مشرق کی طرف سے حملہ کرنے سے پہلے تھوڑا تو بدھری طرف مبذول کرنا چاہتا ہے تم اس فائرنگ کی پرواز کر دو۔ مکان کی چھت سے چند آدمی دشمن کی گولیوں کا جواب دیتے رہیں گے لیکن باقی سب کی توجہ اس طرف ہونی چاہیے۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب یکے بعد دیگرے چند دھماکے سنا دیئے۔ اور شمال اور مشرق کی دیواریں جن کی بنیادیں کھودی جا چکی تھیں۔ کئی جگہ سے گر پڑیں۔ دیواروں میں شکاف

تم نے ہماری جانوں کی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ اور ہمارے پاس روپوں کی بجائے گولیاں ہیں۔

ابھی طرح سوچ لو!

تم جا سکتے ہو۔

مرہٹے افسر نے قدمے توقف کے بعد کہا۔ تم نے جی طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے، ہمارا لشکر شہر کے دوسرے محلوں میں مصروف ہے۔ لیکن اگر ضرورت پڑا تو ہم ان سب کو یہاں لے آئیں گے۔

یہ جگہ کافی کٹھن ہے اور یہاں تمہارے تمام لشکر کی لاشیں سما سکتی ہیں۔ اور شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری فوج تمہارے پیچھے آرہی ہے۔

ہمیں معلوم ہے لیکن جب وہ یہاں پہنچیں گے تو ان کے سامنے صرف تمہاری قبریں کھدنے کا کام ہوگا۔ ہم تمہیں آخری بار سوچنے کا موقع دیتے ہیں، یہی کے بعد تم مرشد آباد کے تمام خزانے ہمدے قلموں میں ڈھیر کر کے تو بھی تمہاری بات نہیں سنی جائے گی۔

تم ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہو۔ لیکن ہمارے پاس تمہارے لیے صرف گولیاں ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔ ہم تمہارے محلے کا انتظار کر رہے ہیں۔

چچا تئیں ریوہ اسطار نہیں کرنا پڑے گا۔

مرہٹے افسر یہ کہہ کر مڑا اور سفید جھنڈا زمین پر پھینک کر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں مرہٹوں نے اس پاس کے چند اونچے مکانات کی چھتوں سے فائرنگ شروع کر دی اور مغظم علی کے سامنے اس کے جواب میں عری کے رہائشی مکان کی چھت سے گولیاں برسانے لگی۔ عذوب آفتاب تک بندوؤں کی یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے فائرنگ بند کر دی۔ ان کے بیشتر آدمی ابھی تک عری کے برآمدی اجالے میں جمع تھے۔ شام



پڑنے کی دیر تھی کہ مرہٹوں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ اندر سے بھی گولیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ لیکن حملہ آور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خندق عبور کرنے کے بعد بانس کی باڑ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ شدید نقصان اٹھانے کے بعد صحن کے اندر ادھر ادھر پھیل گئے اور زمین پر بیٹھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مرہٹوں کی فوج کے ایک حصہ نے براہ راست دروازے سے صحن پر بیغار کرنے کی کوشش کی لیکن رضا کاروں نے انہیں صحن کے درمیانی مورچوں کے قریب نہ آنے دیا۔ توپوں سے پھر ایک بار کام لیا گیا اور مرہٹے بھاری نقصان اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے بعد لڑائی کا سارا زور شمال اور مشرق کی طرف تھا۔ حملہ آوروں کے لیے رات کی تاریکی جس قدر فائدہ مند تھی اسی قدر نقصان دہ بھی تھی۔ وہ دیواریں توڑنے کے بعد اچانک حملہ کر کے حویلی کے محاذوں کی سرسبزی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن رضا کاروں کی غیر متوقع مدافعت نے ان کے حوصلے پست کر دیئے۔ تاریکی میں انہیں اپنے زخمی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی صبح تعداد کا علم نہ تھا۔ تاہم گولیوں کی پوچھاڑی زخمی ہونے والوں کی چیخیں ہر آن ان کی سرسبزی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ چند آدمی رستے کے مورچے توڑنے کے بعد مکان کے قریب پہنچ گئے لیکن تلواروں، خنجروں اور لٹھیوں سے مسلح آدمیوں کا جوم کھول اور بامدوں سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند مرہٹے مارے گئے اور باقی پیچھے ہٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چند حملہ آور مکان پر بیغار کرنے کی بجائے صحن کے درختوں کی آڑ لے کر اُدھر باقی گری ہوئی دیواروں کے پیچھے چھپ کر فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔



اُسی رات کو جب چاند نمودار ہو رہا تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے نقاروں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مرہٹے ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہوئے بردنی دروازے کی طرف سسٹے لگے۔ حویلی کے محافظ بندوؤں کے دھماکوں کی بجائے بھاگتے ہوئے دشمن کے پاؤں کی آہٹ سن رہے تھے۔

معظم علی نے ہارمے کے سامنے ایک مورچے سے باہر نکل کر بلند آوازیں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ دشمن شہر خالی کر رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک چال ہو۔ تم اپنے مورچوں میں چوکس رہو اور میری ہدایات کا انتظار کرو۔ میں ادھر جا کر دیکھتا ہوں۔"

معظم علی تاریکی میں احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ زینے پر پاؤں رکھتے ہی اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ کون ہے؟

"میں ہوں چچا جان! معظم علی نے حسین بیگ کی آواز پہچان کر جواب دیا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرہٹوں نے اچانک گولہ باری کیوں بند کر دی۔ ہے؟"

"میرے خیال میں وہ واپس جا رہے ہیں۔ اور اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن میں ذرا چھت پر جا کر تفتی کروں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

معظم علی کسی وقت کے بغیر زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پاؤں رکھتے ہی اسے ایک کونے سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ چھت پر حسین بیگ کے اپنے نوکر دوں کا پھرتا اور وہ معظم علی کی ہدایات کے مطابق منڈیر کی آڑ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک چھت کے کونے میں کھڑا اطمینان سے اپنی بندوق بھر رہا تھا۔ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے غضبناک ہو کر کہا: بیوقوف اپنا سر نیچے رکھو!"

لیکن اس نے معظم علی کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کے ہاتھ بندوق بھرنے میں مصروف تھے اور نگاہیں صحن میں آگ کے ایک درخت پر لگی ہوئی تھیں۔ معظم علی کو کسی رضا کار یا حسین بیگ کے نوکر سے علم بدلنے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بندوق کا دھماکہ سنائی دیا اور گولی سر کے بالوں کو چھوئی تو ہنسی گر گئی۔ معظم علی جلدی سے دھبہ کر منڈیر کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اسے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن خودکشی کا اسان طریقہ یہ ہے کہ تم گولی کا انتظار کرنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے نیچے جھلا گنگ لگا دو۔“ یہ کہہ کر معظم علی نے جلدی سے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے کچینچ کر نیچے بٹھا دیا۔

”یہ گولی سامنے کسی درخت سے آئی تھی؟“ معظم علی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”تم کون ہو؟“

اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر معظم علی نے کہا: ”تم ذرا نیچے چلی جاؤ۔ لڑکیوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔“

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا اور گھٹنوں کے بل ہو کر صحن کی طرف جھانکنے کے بعد اچانک ایک فائر کر دیا۔

معظم علی نے گردن اوپر کر کے صحن کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: ”تم ہوائیں فائر کر رہی ہو اور دیکھو گردن نیچے رکھو!“

لڑکی نے کہا: ”اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو میرا نشانہ خالی نہ جاتا۔ اب وہ دوسری شاخ پر جا چکا ہے۔ یہ میری بندوق بھر دیکھیے اور مجھے اپنی بندوق دیکھیے۔ جلدی کیجیے وہ نیچے اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”یہ لو۔“ معظم علی نے اپنی بندوق آگے بٹھاتے کہا: ”تم اسے دیکھ سکتی ہو؟“

”ہاں۔“ لڑکی نے اٹھ کر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔

”خدا کے لیے اپنا سر نیچے رکھو۔“ معظم علی نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں آخری بار آپ کی حکم برداری کر رہی ہوں۔“ لڑکی نے یہ کہہ کر بندوق چلا دی صحن میں آم کے درخت سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی۔

معظم علی نے کہا: ”اب تمھاری ضد پوری ہو چکی ہے۔ لیکن ایک مرہٹے کے لیے تمھیں اپنی

جان خطر سے جس نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔“

دہاں ایک نہیں تھا۔ میں نے اپنے کمرے کے دریچے سے چار آدمی درخت پر چڑھتے دیکھے تھے۔ ایک کو میں نے دہاں سے فائر کر کے گرا لیا تھا۔ دو بھاگ گئے تھے۔ اور یہ چوتھا کمرے کے دریچے سے میرے نشانی کی زد میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے اوپر اٹھنا پڑا۔“

معظم علی نے چاند کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر سفید گچھی تھی اور گلے میں بارود کا تھیلانگ رہا تھا۔ معظم علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتے ہوئے کہا: ”تم فرحت ہو؟“

لڑکی نے شکایت کے لہجے میں کہا: ”آپ نے مجھے گالیاں دی ہیں۔“

”مجھے کسی سپاہی سے حکم مدد کی توقع نہ تھی۔ اور تمھیں بلا وجہ جان خطرہ میں ڈالنے سے

منع کرنا میرا فرض تھا۔ لیکن اگر تم خفا ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

”میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”اب تم اطمینان سے نیچے جا کر سو جاؤ، اب حملے کا کوئی خطرہ نہیں، مرہٹے سپاہی ہو رہے ہیں۔ گلی سے ان کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔“

چھت کے پہریدار اٹھ اٹھ کر صحن کی طرف جھانکے اور ایک دوسرے کو یہ خوشخبری سناتے

گئے۔ ”مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔ مرہٹے بھاگ رہے ہیں۔“

معظم علی نے بھری ہوئی بندوق فرحت کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی بندوق واپس لے

لی اور کہا: ”اب شاید آپ کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔“

فرحت کچھ کے بغیر زینے کی طرف چل دی اور معظم علی نے رضا کاروں کی طرف متوجہ

ہو کر کہا: ”تم بہت غیر ذمہ دار ہو۔ اگر مرزا صاحب کی صاحبزادی اپنی بے احتیاطی کے باعث زخمی

ہو جاتی تو ہم انھیں کیا منہ دکھاتے؟“



حسین بیگ کے ایک نوکر نے کہا: جناب ان کے لباس سے دھوکا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی رضا کار ہے۔

”لیکن کسی رضا کار کو بھی جھٹ پرکھا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ تمہارا فرض تھا کہ تم انہیں بے احتیاطی سے منع کرتے!“

حسین بیگ کے نوکر نے جواب دیا: ”ہم نے انہیں منع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہماری طرف توجہ دینے کی بجائے اچانک ہندوق چلا دی۔ اتنی دیر میں آپ پہنچ گئے۔“

معظم علی نے اٹھ کر چھت کی چاروں طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میرے خیال میں اب میدان خالی ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک مجھے حویلی کے باہر کے حالات کے متعلق تسلی نہیں ہوتی تمہیں جو کس رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تک چند آدمی درختوں کی آڑ میں چھپے ہوئے ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد معظم علی پندرہ رضا کاروں کے ساتھ اندرونی صحن کے طول و عرض میں چکر لگانے کے بعد باہر کے احاطے میں پہنچا۔ حمد آدر و فخر ہو چکے تھے۔ حویلی کے مختلف گوشوں میں دشمن کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور جگہ جگہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں، مرنے والے حسین بیگ کے اسطبل سے میں گھوڑے اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔

معظم علی رضا کاروں کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا۔ قریباً ایک گھنٹہ محلے کی گلیوں میں چکر لگانے کے بعد اس نے واپس آکر اعلان کیا: ”مرنے جا چکے ہیں۔ خدانے ہماری مدد کی ہے اب اس کی بارگاہ میں سجدوں کا وقت ہے۔“

خواتین، بچے، بوڑھے اور جوان خوشی کے نعروں اور مسرت کے آوازوں سے اس کے اعلان کا خیر مقدم کر رہے تھے مکان کے اندر خواتین معظم علی کی ماں کے گرد جمع ہو کر شکر اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار کر رہی تھیں اور مکان سے باہر مردوں کا ہجوم معظم علی کو کہتے میں بیٹھ ہوئے تھا۔ وہ ان کے لیے ایک قابل فخر مینا، ایک قابل عزت بھائی اور ایک قابل اعتماد دوست بن چکا تھا۔

معظم علی نے رضا کاروں کو مشعلیں جلانے کا حکم دیا اور برآمدے کی سیڑھی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہا: ”بھائیو! کمروں کے اندر خواتین اور بچے گرمی کے باعث سخت تکلیف میں ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اب تمام مرد حویلی کے بیرونی احاطے میں چلے جائیں تاکہ ہماری بہنیں باقی رات کھلی ہوا میں سانس لے سکیں۔ مسلح رضا کاروں کے لیے میرا یہ حکم ہے کہ وہ صبح تک بیرونی فصیل کے مورچوں میں پہرہ دیں۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ مرنے والے دوبارہ حملہ کریں گے تاہم میں نے احتیاط کے طور پر چند آدمیوں کو باہر کے راستوں پر پہرہ دینے کے لیے بھیج دیا ہے۔ آپ کورات کا کھانا نہیں ملا۔ مرزا صاحب نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ سب کے لیے دسترخوان کچھا دیئے جائیں گے۔“

تھے۔ لیکن وہ اُن تک نہیں کرتا تھا۔

معظم علی نے سوال کیا: چچا جان! آپ نے شہر کے حالات معلوم کیے ہیں؟  
حسین بیگ نے جواب دیا: شہر میں مرہٹوں نے کافی لوٹ مار کی ہے۔ جگت سیٹھ کے محل سے وہ بیس لاکھ روپیہ نکال کر لے گئے ہیں۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم شہیدوں کے نازے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اس کے بعد شام کے چار بجے تمہیں میرمن کے پاس جانا ہے۔  
"میرمن کے پاس؟"

"ہاں تم سو رہے تھے انہوں نے تمہیں جگنہ کی اجازت نہیں دی۔"

"وہ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں وہ آئے تھے اور حویلی کا معائنہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ فوج کے چند اور افسر بھی تھے۔ وہ تمہاری کارگزاری پر بہت خوش تھے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "انہیں آپ نے یہاں بلایا تھا؟"

حسین بیگ نے جواب دیا: "بیٹا انہیں یہاں آنے کے لیے کسی کے بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے یہ خبر کافی تھی کہ اس حویلی میں دو سو مرہٹوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔"

عمود علی نے کہا: "راستے میں ہماری طرح میری مدن بھی اس محلے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کی حویلی بہت غیر محفوظ ہے۔ لیکن شہر میں داخل ہوتے ہی جب ہمیں مرہٹوں کے نقصانات کی اطلاع ملی تو انہوں نے کہا کہ میں سب سے پہلے مرزا صاحب کی حویلی دیکھنا چاہتا ہوں۔"



شام کے چار بجے معظم علی شاہی محل کی چل دیوادی کے اندر میرمن کے مکان میں داخل ہوا۔ ایک سپاہی اسے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں ایک نوجوان افسر کے پاس لے گیا۔

## پہو تھا باب

صبح کی نماز کے بعد محلے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ معظم علی تھا کاوٹ سے نڈھال ہو کر دیوان خانے کے برآمدے میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو عمود علی، یوسف، حسین بیگ، اصف اور افضل اس کی چارپائی کے گرد کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر یکے بعد دیگرے اپنے باپ، بھائی، اور دوستوں سے بغل گیر ہوا۔

افضل نے کہا: "معظم تم نے تو ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا ہے!"

حسین بیگ بولا: "بیٹا اگر مرہٹے ہمیں ایک دو ماہ اور مہلت دیتے تو معظم اس محلے کے ہر مکان کا نقشہ بدل دیتا۔"

عمود علی نے کہا: "ہم راستے میں بہت پریشان تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ورنہ یہ محلہ بہت غیر محفوظ تھا۔"

حسین بیگ نے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ اب محلے کے لوگ میرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر معظم کا قیاس غلط ثابت ہوا تو مجھے اس شہر سے ہجرت کرنا پڑے گی" سلطان خان نے میرا مذاق اڑانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لیکن جب مرہٹوں کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سارے شہر سے اپنی برادری کے لوگوں کو جمع کر کے یہاں آگیا تھا۔ رات کے وقت وہ میرے کتب خانے میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ تاریکی میں اسے ٹھوکر مار رہے تھے۔



تشریف رکھیے، افسر نے اپنے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا  
"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

معظم علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: "میرا نام معظم علی ہے اور مجھے میرا صاحب نے  
بلا یا ہے۔"

افسر چونک کر کرسی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔  
"آپ محمود علی کے صاحبزادے ہیں؟ معاف کیجیے۔ میں آپ کو بڑی عمر کا آدمی سمجھتا تھا۔ میرا  
صاحب چند افسروں سے بات کر رہے ہیں۔ آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

معظم علی افسر سے مصافحہ کرنے کے بعد دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیے خاموشی سے  
معظم علی کی طرف دیکھنے کے بعد افسر نے کہا:

"میرا نام گوہر خان ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"  
تھوڑی دیر بعد فوج کے چند افسروں کو دیوان خانے کے ایک کمرے سے باہر نکلتے دیکھ  
کر گوہر خان نے کہا:

"پہلے اب وہ فارغ ہو گئے ہیں۔"

معظم علی گوہر خان کے پیچھے ہولیا۔ صحن عبور کرنے کے بعد وہ دیوان خانے کے برآمدے  
میں داخل ہوئے اور گوہر خان معظم علی کو رکنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوا۔ چند ثانیے بعد اس  
نے باہر نکل کر معظم علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔

سلطنت و جدوت کا ایک پیکر عجم کرسی سے اٹھ کر دو تین قدم آگے بڑھا اور معظم علی کے ساتھ  
مصافحہ کرتے ہوئے بولا: "مجھے انوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ میں بہت مسرور تھا۔"  
مجھے آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔

"بیٹھ جاؤ!"

معظم علی میرمن کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرمن نے کہا: "میں تمہاری کارگزاری دیکھ چکا ہوں اور مجھے تم پر فخر ہے۔"  
"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" معظم علی نے احسان مندی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے

جواب دیا۔

میں نے تمہیں اس لیے بلا یا ہے کہ بنگال کی فوج کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔  
مرزا حسین بیگ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہیں فوج کی ملازمت پسند نہیں۔ میں یہاں  
ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں اور ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے  
کہ میں تمام کارآمد نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کروں۔ محلے کی حفاظت کے سلسلہ میں تمہاری کارگزاری  
دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تمہارے سیاسی نظریات خواہ کچھ ہوں۔ موجودہ حالات میں تم  
بنگال کی فوج کے لیے اپنی خدمات کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکو گے۔ مرہٹوں کے ساتھ  
گذشتہ لڑائیوں میں میرے چند بہترین سالار شہید ہو چکے ہیں اور میری دلی خواہش ہے کہ ان میں سے  
ایک کی جگہ اسی وقت پر کردی جائے۔ آج تک میں نے عہدوں کی تقسیم کے لیے کسی کی سفارش  
قبول نہیں کی۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

معظم علی نے پریشان ہو کر کہا: "اگر مرزا صاحب نے میری سفارش کی ہے تو مجھے بہت  
انوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کریں گے۔"

میرمن نے مسکراتے ہوئے کہا: "برخوردار! مرزا حسین بیگ نے نہیں بلکہ ان کی حویلی  
میں بڑی ہوئی دوسو مرہٹوں کی لاشوں نے تمہاری سفارش کی تھی۔ پھر جب میں تمہارے محلے کی گلیوں  
سے گزر رہا تھا تو بچوں اور بوڑھوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو مجھے یہ پیغام دے رہے تھے  
کہ اس محلے میں ایک نوجوان ایسا ہے جس کی عزت، محبت اور ذہانت پر تم اعتماد کر سکتے ہو۔  
معظم علی نے کہا: "لیکن میں نے صرف ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ فخر  
کارنامہ نہیں۔"

"تم نے ایک چھوٹی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اب میں تمہیں ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے

کی دعوت دے رہا ہوں۔

معظم علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: اگر یہ دعوت کسی اور کی طرف سے ہوتی تو میں سوچے بغیر انکار کر دیتا لیکن آپ کے سامنے بات کرنا بھی میرے نزدیک گستاخی ہے۔  
تھیں بات کرنے کی ضرورت نہیں: میرے مدن نے یہ کہہ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو معظم علی نے کہا: میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے مذہب اور پریشانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس قیادت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو قوم کے اجتماعی تقاضوں کی بجائے اپنی ضروریات کے مطابق دوستوں اور دشمنوں کے متعلق اپنا زائد نگاہ بلیتی رہتی ہے۔

میرمن نے کھابو کاغذ معظم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: سپاہی ہمیشہ سیاستدانوں کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ اور تم ایک سپاہی ہو۔ میں بنگال کی فوج کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہوں جو قوم کے مستقبل کے متعلق ہمیشہ موقع پرست سیاستدانوں کے ذہن سے سوچتے ہیں اور تمہارے جیسے حقیقت پسند اور فرض شناس فوجیوں کے تعاون کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی دن فوج کے سپاہیوں میں وہ اجتماعی ضمیر بیدار کر سکو گے جو سیاسی طاع آزادیوں کی کوتاہیاں برداشت نہیں کرے گا۔ یہ تمہاری تقرری کا حکم نامہ ہے۔ میں تمہیں دو دن سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اگر تم نے دو دن کے بعد فوج میں عارضی زدی تو یہ حکم نامہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا۔ اور مجھے اس بات کا انوس ہو گا کہ میں ایک مضبوط پتھر کو قوم کے دفاعی حصار کی تعمیر کے لیے کام میں نہ لاسکا۔ مرشد آباد میں اب کچھ عرصہ حملے کا کوئی خطرہ نہیں لیکن جنوب مغربی اندلاع کے لیے خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ میرے صیب سے زیادہ ہماری کمزوریوں سے کوئی واقف نہیں۔ وہ مرشد آباد میں اپنی ناکامی کا بدلہ لینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔

معظم علی نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اس وقت، بردوان، میدناپور اور ہنگی کے علاقے خطرے میں ہیں اور اگر میں ایک سپاہی ہوں تو مجھے سوچنے کے لیے دو دن کی ضرورت نہیں

میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کل ہی اپنے دستے کی کمان سنبھال لوں گا۔



علی دردی خاں مرشد آباد میں اپنی افواج کو از سر نو منظم کر رہا تھا کہ مرشد افواج نے میرے صیب کی قیادت میں اچانک ہنگی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ برسات کی وجہ سے مرشد آباد سے رسید ممکن کے راستے بند ہو چکے تھے اور مرشد نے کسی موثر زاحمت کا سامنا کیے بغیر بردوان، میدناپور اور بامر کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ اور چند ہفتوں میں حالت یہ ہو گئی کہ مرشد آباد کے جنوب مغرب میں کوئی علاقہ مرہٹوں کے حملوں کی زد سے محفوظ نہ تھا۔

برسات کی شدت کم ہوتے ہی علی دردی خاں نے پوری تیاری کے ساتھ مرشد آباد سے پیش قدمی کی اور کٹوے کے قریب دریائے بھاگرتی کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ مرشد افواج نے چاروں طرف سے سمٹ کر بھاگرتی کے دوسرے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریب آتیس دن فریقین اپنے اپنے کیمپوں سے ایک دوسرے پر گولہ باری کرتے رہے۔ اس عرصہ میں مرہٹوں کو یہ اطلاع ملی کہ اودھ کا صوبہ دار اپنے لشکر کے ساتھ علی دردی خاں کی مدد کے لیے آ رہے ہیں چنانچہ انھوں نے ایک گھمسان کی جنگ کے بعد پسپائی اختیار کی۔ چند دنوں میں علی دردی خاں کی افواج نے مرہٹوں کو بردوان، ہنگی اور میدناپور کے علاقوں سے نکال دیا۔ ہر محاذ سے مرہٹوں کی عام پسپائی شروع ہو چکی تھی اور بنگالی فوج کے تیز رفتار ہراول دستے ان کی افزائش سے پرانا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

معظم علی ہراول دستوں کے ان چند افسروں میں سے ایک تھا جو پورے لشکر کی توجہ کا مرکز بن چکے تھے۔ دشمن کے نقاب میں یہ لوگ باقی فوج سے ہمیشہ ایک منزل آگے رہتے تھے۔ مرشد فوج کئی کئی کوس بھاگنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈالتی۔ لیکن یہ لوگ اچانک حملہ کر کے ان کو دوبارہ بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ معظم علی کی کمان میں پانچ سو سوار تھے اور وہ چند دنوں میں دشمن کے پیچھے توپوں اور سامانِ رسد کی ستر گاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا۔



علی وردی خاں نے اڈیہ کی سرحد تک، سرہٹوں کا تعاقب کیا۔ ایک شام بنگال کی افواج نے جھیل چھلکا کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور علی وردی خاں نے افسروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ یہ ہماری آخری منزل ہے۔ اب اس سے آگے جانا بے سود ہے۔

رات کے وقت جب فوج فوج کا جشن منا رہی تھی۔ میرمدن، علی وردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: "عالیجاہ! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہراول فوج کے ایک سالار نے واپس آنے کی بجائے یہاں سے کوئی چودہ میل دور دشمن کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا ہے۔"

علی وردی خاں نے برہم ہو کر کہا: "یہ میرے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میں نے تمام فوج کو یہاں جمع ہونے کا حکم دیا تھا وہ سالار کون ہے؟"

"عالیجاہ وہ معظم علی ہے۔"

"لیکن ہراول فوج کو سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی!!"

"عالیجاہ اس نے سرحد عبور نہیں کی۔ یہ قلعہ ہمارا تھا اور مرہٹے چند سال سے اس پر قابض پڑے آتے ہیں۔"

"اور وہ احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پانچ سو سپاہی سرہٹوں کے تمام لشکر کو موت کے گھاٹ اتار کر قلعے پر قابض ہو جائیں گے؟"

"عالیجاہ! میرے خیال میں وہ اب تک قلعے پر قابض ہو چکا ہوگا۔ جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کے مطابق وہ ہراول کے باقی دستوں سے کٹ کر سرہٹوں کے لشکر سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سرہٹوں کے دہاں پہنچنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسے کمک نہ بھی گئی تو سرہٹوں کا لشکر دہاں پہنچے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لے گا اور ہماری فوج کے پانچ سو بہترین سپاہی مارے جائیں گے۔"

علی وردی خاں نے کہا: "اگر صورت یہ تھی تو تمہیں کمک بھیج کر میرے پاس آنا چاہیے تھا۔"

میرمدن مسکرایا: "عالیجاہ میں فوج کو تیاری کا حکم دے آیا ہوں۔ صرف آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔"

"کتنے سپاہی لے جا رہے ہو؟"

"پانچ ہزار۔"

"جاؤ!"

جب میرمدن خیمے سے باہر نکل رہا تھا تو علی وردی خاں نے کہا:

"انشاء اللہ کل ہم وہ قلعہ دیکھنے آئیں گے۔"



میرمدن کا قیاس درست تھا۔ معظم علی غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ قلعے کی حفاظت کرنے والے پچاس سپاہیوں میں سے چوبیس ہلاک اور زخمی ہو چکے تھے۔ پندرہ گرفتار اور باقی ایک چور دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔

معظم علی نے قلعے کے برج پر بنگال کا جھنڈا نصب کرنے کے بعد اپنے سپاہیوں سے کہا:

"بہادر! مجھے معلوم ہے کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ لیکن آج رات شاید تمہیں کلام نصیب نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر تک سرہٹوں کا لشکر یہاں پہنچ جائے گا۔ لیکن اگر تم صبح قلعے پر قبضہ کر سکیں تو انشاء اللہ ہماری فوج پہنچ جائے گی اور ہمارے ہاتھ میں ایک اور شاندار فتح ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے ہمت ہار دی اور مرہٹے دوبارہ قلعے پر قابض ہو گئے تو ہمارے لیے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ قلعے میں اتنا بارود ہے کہ ہم چند گھنٹے دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں نصیب کے ہر حصے پر چوکس رہنا چاہیے۔"

مرہٹہ فوج کے سرداروں کو اس بات کا یقین تھا کہ علی وردی خاں کا لشکر ان کا مزید تعاقب نہیں کرے گا اور وہ سرحدی قلعے میں پناہ لے کر اپنے مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکیں گے۔ لیکن کوئی دو کس کے فاصلے پر قلعے سے فرار ہونے والے سپاہیوں نے انہیں یہ خبر دی کہ

بنگل کے مٹی بھر سپاہی قلعے پر قابض ہو چکے ہیں۔ مرہٹہ سردار قلعہ کے محافظوں کو بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیتے ہوئے آگے بڑھے اور اسی رات کے قریب انھوں نے قلعے سے کوئی آٹھ میل دور شمال کی جانب چڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد میر حبیب اپنے پانچ ہزار آدمیوں کو کار سپاہی لے کر آگے بڑھا اور اس نے قلعے کا حاصرہ کر لیا۔

پچھلے پرشید گولہ باری کے بعد مرہٹوں کا شکر چاروں طرف سے قلعے پر لیٹا کر رہا تھا اور معظم علی کے ساتھی ملک پیچنے کی امید پر اپنے مورچوں میں ڈلے ہوئے تھے۔ اچانک جنوب مشرق کی سمت سے گولیوں کی بارش ہونے لگی اور مرہٹہ فوج میں افزائی پھیل گئی۔ وہ مغرب کی طرف سمٹنے لگے۔ سردار دیر بعد مغرب کی طرف بھی درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے مرہٹوں پر گولیاں برسنے لگیں اور کوئی آٹھ گھنٹے بعد مرہٹے انتہائی انتشار کی حالت میں شمال کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میرمدن نے اپنے سواروں کو عام حملے کا حکم دیا اور ان کی آن میں میدان خالی ہو گیا۔ بنگال کی فوج چڑاؤ تک مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آگئی۔

صبح کے دھندلکے میں معظم علی اور اس کے ساتھی قلعے سے باہر نکل کر میرمدن کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

میرمدن کے دائیں بائیں محمود علی، دوست، کامنٹ اور افضل بیگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔ میرمدن نے دو سو کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی سے مخاطب ہو کر کہا: تمہیں اس قلعے پر حملہ کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟

یہ سوال اذیہ لب دلجو معظم علی کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ ایک تائید کے لیے مذہب اور پریشانی کی حالت میں میرمدن کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے باپ بھائی اور دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔ معظم علی نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔

”لوئے کیوں نہیں؟ میرمدن نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔  
معظم علی نے جواب دیا: اس قلعے پر حملہ کرنے کے لیے مجھے کسی نئے حکم کی ضرورت نہ تھی۔

میراپہ اقامت آپ کی منشا کے عین مطابق تھا۔  
میرمدن نے مڑ کر محمود علی کی طرف دیکھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: لیکن تمہارے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ انھیں آرام کی ضرورت تھی۔“

ایسے حالات میں سپاہی کے لیے گھوڑے کی زین لیٹر سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ پھر نہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قلعہ ان کے سفر کی آخری منزل ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ جی بھر کر آرام کر سکیں گے۔“

میرمدن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا: معظم علی تمہارا یہ کارنامہ میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن تم نے ہمیں آرام کی دعوت نہیں دی؟“  
معظم علی نے جواب دیا: اند چلیے، میں نے آپ سب کے لیے آرام کا انتظار کر رکھا ہے۔



دوپہر کے وقت قلعے سے باہر ایک کشادہ خیمے کے اندر علی دردی خاں کا دربار لگا ہوا تھا اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی خیمے کے اندر داخل ہوا اور وہ بنگال کے حکمران کو سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں نے گاؤتیکے کا سہارا چھوڑ کر سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا: ”تو جوان! ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟“  
معظم علی نے جواب دیا: ”عالی جاہ! مجھے یقین تھا کہ میں چند گھنٹے اس قلعے پر قبضہ رکھ سکتا ہوں اور اتنی دیر میں سپہ سالار کمک بھیج دیں گے۔“

”لیکن ملک پیچنے میں دیر ہو جاتی تو کیا ہوتا؟“  
”عالی جاہ! میں نے کیے بعد دیگرے آٹھ سو اڑھائی طرف روانہ کر دیئے تھے اور میرمدن کی موجودگی میں کمک کے دیر سے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

رات کے وقت اس قلعے کی طرف تمہاری رہنمائی کرنے والا آئے۔



مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ میں اس علاقے کا ہر نشیب و فراز اپنے ہاتھ کی لیکروں کی طرح جانتا ہوں۔

علی وردی خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”نوجوان! میں تمہیں اس قلعے کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔ اگر تمہارے متعلق میرے مدین کے خیالات صحیح ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کرو گے۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”عالی جاہ! میں میرے مدین کی توقعات پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔“

چوتھے روز معظم علی اس قلعے کے کمانداری کی حیثیت میں بنگال کے لشکر کو الوداع کہہ رہا تھا۔ قلعے کے قریب ایک بلند ٹیلے سے بنگال کی افواج کی آفری جھک دیکھنے کے بعد اس نے اپنے پانچ سو سپاہیوں کو قلعے کی چار دیواری کے اندر جمع ہونے کا حکم دیا اور ان کے سامنے تقریر کی۔

”میرے ساتھیو! تم مجھے معلوم نظر آئے ہو۔ ہم اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور پھینک دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک بہت بڑی ذمہ داری کا اہل سمجھا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قلعہ بنگال کی ایک دو راہہ چوکی نہیں بلکہ مرشد آباد کے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس دیرانے میں رہ کر ان گھروں کی حفاظت کریں گے جو یہاں سے سینکڑوں کوس دور ہیں اور ہمیں یہ تسکین ہوگی کہ ہماری دہرے ہماری قوم کے لاکھوں افراد آرام کی نیند سوتے ہیں۔“

میرمدن نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اس قلعے کو مستحکم بنانے کے لیے وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے اور میں ان کے ساتھ یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے، اس قلعے پر بنگال کا پرچم لہرا رہے گا۔ یہ قلعہ بہت اہم ہے اور ہمیں اسے ناقابل تسخیر بنانا ہے۔“

اگلے دن معظم علی کے سپاہی اس قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کی مرمت کا کام شروع کر چکے تھے۔

ایک سال بعد کٹک کا فوجدار اس قلعے کے معائنے کے لیے آیا تو اس نے علی وردی خاں کو یہ خط لکھا:-

”ایک سال بعد یہ قلعہ دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ معظم علی نے اس کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی فصیل کی جگہ ایک نئی فصیل تعمیر ہو چکی ہے۔ قلعے کے اندر سپاہیوں کی رہائش کے لیے نئی کوٹھڑیاں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ اور فصیل سے باہر خندق کھودنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر نو کے لیے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت قلیل تھی اور معظم علی نے اخراجات بچانے کے لیے تعمیر اور مرمت کا بیشتر کام اپنے سپاہیوں سے لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر معظم علی کچھ عرصہ اور یہاں رہا تو دفاعی لحاظ سے ہمارا یہ سرحدی قلعہ بہت مضبوط بن جائے گا۔“

اس قلعے کے دفاعی انتظامات بہتر بنانے کے علاوہ معظم علی نے ارد گرد کے جنگلات مرطوب ڈاکوؤں سے پاک کر دیئے ہیں اور سرحد کی اجڑی ہوئی بستیوں کو دوبار آباد ہو رہی ہیں ان بستیوں کی حفاظت کے لیے مقامی رضا کاروں کی فوج منظم کی جا رہی ہے اور اب تک معظم علی کے سپاہی قریباً ایک ہزار آدمیوں کو فوجی تربیت دے چکے ہیں۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق معظم علی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو تمہیں مرشد آباد تبدیل کیا جاسکتا ہے، میرا خیال تھا کہ وہ یہ بات سن کر خوشی سے چہل پڑے گا۔ لیکن اس نے مجھے یہ جواب دیا کہ ابھی اس علاقے میں میرا کام ختم نہیں ہوا ہے، ابھی اس علاقے میں از سر نو آباد ہو جانے والے لوگوں کو میری ضرورت ہے اور یہ جذبہ صرف معظم علی میں ہی نہیں بلکہ اس کا ہر سپاہی محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔“

## پانچواں باب

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ سرحدی قلعے کے کمان دار کی حیثیت میں معظم علی کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ مرشد آباد کے متعلق نہیں سوچتا تھا۔ کبھی وہ بچپن کے ان ایام کا تصور کرتا جب وہ یوسف، افضل اور آصف بیگ کے ساتھ اپنے محلے کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیلئے لگتی۔ کبھی اسے اپنے والدین کا خیال آتا اور اسے قلعے کی فضائیں اور اس محسوس ہونے لگتیں بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کی تصویریں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آتیں۔ اور بالآخر مرشد آباد کے متعلق اس کے تمام تصورات ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہو کر رہ جاتے۔ ایک ایسی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی جس کے کوئی مستقل خطہ حال اس کے ذہن پر نقش نہ تھے اور اس کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے لبریز ہو جاتی۔ وہ رات کے وقت کھلی فضا میں لیٹے لیٹے کبھی بلند آوازیں اور کبھی دبی زبان سے فرحت کا نام پکارتا اور کائنات کی وسعتیں ستاروں کے نمنوں سے لبریز ہو جاتیں۔ لیکن پھر اچانک تصورات کے یہ سنرے تار ٹوٹ جلتے اور وہ گہری نیند سو جاتا۔

ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس نے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی تھی کہ زندگی کی کسی منزل میں فرحت اور اس کا راستہ ایک ہو سکتا ہے۔ تاہم فرحت نے متعلق موبوس، دکش اور دلفریب تصورات اس کے خیالوں اور سپنوں کی دنیا پر حاوی

ہوتے جا رہے تھے۔ مرزا حسین بیگ، آصف اور افضل بیگ کے نام اس کے ہر خط کی آخری سطر پر "سندگان" حال کو سلام کے الفاظ پر ختم ہوتی تھی اور یہاں ایک جملہ اس کے نزدیک تمام خط سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ آصف کو خط کا جواب لکھنے کی عادت نہ تھی لیکن افضل اور حسین بیگ نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کے خطوط کا جواب دیا کرتے تھے حسین بیگ کے خطوط میں ایک پیرا نہ شفقت کا اظہار ہوتا۔ افضل کے خطوط بنگال کی سیاسی صورت حالات کے تذکروں سے لبریز ہوتے۔ کبھی کبھی وہ ایک آدھ فقرہ اپنی بہن کے متعلق بھی لکھ دیتا اور معظم علی اسے پڑھ کر اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرنے لگتا۔ فرحت اچھی سے انہیں سلام کرتی ہے۔ آج فرحت کتنی تھی کہ تمہاری امی جان بہت مغموم رہتی ہیں، اس لیے تمہیں چند دن کے لیے گھر ضرور آنا چاہیے اور معظم علی کا جی چاہتا کہ وہ اگر مرشد آباد پہنچ جائے اپنی والدہ کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ احساس کارفرما ہوتا کہ وہ اس کی دسالت سے فرحت کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔ معظم علی کی ماں اپنے خطوط میں فرحت کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا کرتی تھی۔ اگر کسی خط میں فرحت کا ذکر نہ ہوتا تو اسے ایک قسم کی تکلیف محسوس ہوتی اور وہ جواب میں شکایت کرتا: امی جان آپ نے مرزا حسین بیگ اور ان کے بال بچوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی؟ اور ماں کی طرف سے اس قسم کا جواب آتا: "میا! میں تمہارا خط ملتے ہی ان کے ہاں گئی تھی۔ وہ سب بخیریت ہیں، فرحت بہت خوش ہے، وہ تمہارے متعلق پوچھتی تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتی ہے تمہارے متعلق پوچھا کرتی ہے۔ پچھلے دنوں میں ٹیل تھی اور وہ ہر روز میری تیمارداری کے لیے آیا کرتی تھی۔ بڑی نیک لڑکی ہے، وہ پوچھتی تھی کہ تم چند دن کے لیے چھٹی لے کر گھر کیوں نہیں آجائے؟"



علی دروی خان ایک بیدار منظر نگار تھا۔ لیکن اس کے عہد حکومت میں سلطنت



بنگال ایسے سیاسی شاطروں کی آماجگاہ بن چکی تھی جو قوم کی عزت و آزادی کو ہر وقت داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مسند اقتدار کے یہ بے حیا دعویدار کبھی کسی صوبہ دار یا فوجدار کے ساتھ ساز باز کرتے، اسے علی وردی خان کے مقابلے میں لے آتے اور کبھی مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے۔ علی وردی خاں کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی تھی۔ جو بنگال کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے موقع کے انتظار میں رہتے تھے بنگال کے اندر حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور فوجی افسر اور بنگال سے باہر مرہٹہ لیڈروں کے لشکر ایسے لوگوں کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوتے۔

یہ وہ دور تھا جب بنگال کی سیاست رائے عامہ کے محاسبہ سے قطعاً آزاد تھی۔ علی وردی خاں کبھی اپنے گھر کے غداروں سے لڑتا اور کبھی بریدنی حملہ آوروں سے مقابلہ کرتا۔ جب اندرونی بغاوت کا خطرہ پیش آتا تو وہ مرہٹوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوتا اور جب مرہٹے دوستی کے تمام معاہدے توڑ کر بنگال کے حدود میں آگھستے تو وہ شکست خوردہ غداروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی بجائے اٹھا کر گلے لگانے کی ضرورت محسوس کرتا۔

علی وردی خان کو اس لحاظ سے کامیاب سیاست دان کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے حریفوں کے درمیان ایسا توازن قائم رکھا کہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر اس کے اقتدار پر فیصلہ کن ضرب نہ لگاسکے۔ لیکن اپنے تدبیرا ذہانت اور موقع شناسی کے باوجود وہ ان فتنوں کا سدباب نہ کر سکا جو بالآخر اس کے جانشین نواب سراج الدولہ کی شکست اور بنگال کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ وہ بریدنی خطرات کے مقابلے کے لیے ملک کے عوام کا مدافعتیہ شعور اور اندرونی غداروں کے خلاف قوم کی قوت محاسبہ بیدار نہ کر سکا۔

علی وردی خاں کے دربار میں میر جعفر کے عروج کے ساتھ بنگال کی تباہی کے اسباب مکمل ہو چکے تھے۔ وہ ان قسمت آزمادوں سے کہیں زیادہ دور اندیش تھا۔ جو سلطنت کے عہدیداروں

کے گھٹ جوڑیاں مرہٹوں کے تعاون سے بنگال کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اور اس کی راہنمائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنا مستقبل ان انگریز تاجروں کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ جو فورٹ ولیم میں بیٹھ کر نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔

میر جعفر کا طریق کار ان طالع آزمادوں سے مختلف تھا جو کھلے ہندوں علی وردی خاں کے ساتھ قوت آزمائی کر کے اپنی شکست یا تباہی کا خطرہ مول لیتے تھے۔ وہ درپردہ ان تمام بغاوتوں اور سازشوں میں شریک تھا جو بتدریج بنگال کی قوت مدافعت کو منہوج کر کے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔

یہ بعد دیگرے بنگال کے امراء کی بغاوتوں نے اس کی کامیابی کے راستے صاف کر دیئے۔ علی وردی خاں جو عام حالات میں میر جعفر کو اپنا ایک حقیر ساتھی سمجھتا تھا، یہاں تک مجبور ہو گیا کہ اسے قابل اعتماد دوست سمجھنے لگا اور یہ ایک حقیقت پسند انسان کی مجبوری نہ تھی بلکہ اس سیاست دان کی مجبوری تھی جو برائیوں کو ختم کرنے سے ناامید ہو کر ان سے اچھے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میر جعفر، اڑیسہ کا نائب صوبیدار مقرر ہوا تو مرشد آباد کے امراء جو اسے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتے تھے، چونکہ اس نے جلد ہی ایک اور کامیابی حاصل کی یعنی بنگالی میدان پور کی فوجداری بھی حاصل کر لی، ہو سکتا ہے کہ دربار میں اپنے ایک رشتہ دار کی سازشوں سے تنگ آکر علی وردی خان نے اسے مرشد آباد سے دور بھیجنا مناسب خیال کیا ہو۔ لیکن بنگال کے سن رسیدہ حکمران کو کیا معلوم تھا کہ بنگالی میں ایک فوجدار کی حیثیت سے میر جعفر کا اثر و رسوخ بنگال کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہو گا۔ بنگالی اور مید پور میں علی وردی خاں کی لگابوں سے دور رہ کر وہ زیادہ آزادی کے ساتھ انگریزوں کی سازشوں میں شریک ہو سکتا تھا۔

اڑیسہ پر مرہٹوں اور افغانوں کے متحدہ حملے کی خبریں مشہور رہی تھیں۔ ایک دن مرشد آباد کے پریشان حال لوگوں نے یہ سنا کہ ہنگلی سے میر جعفر کی کمان میں سات ہزار سوار اور بارہ ہزار پیادہ فوج کٹک کا رخ کر رہی ہے۔ پھر کوئی ایک ہفتہ بعد یہ اطلاع آئی کہ میر جعفر دشمن کو شکست دینے کے بعد ان کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر جب مرشد آباد میں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں، یہ خبر آئی کہ حملہ آوروں کی مدد کے لیے رانگھوجی کا بیٹا جانوجی ایک بڑی دل فشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے اور میر جعفر اس کا سامنا کرنے کی بجائے اٹھ پاؤں بردوان کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک اڑیسہ کے طول و عرض میں مرہٹوں اور افغانوں کی وٹ مار کی خبریں آتی رہیں۔ معظم علی کے دوست اور عزیزان خبروں سے بہت پریشان تھے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ دور افتادہ سرحدی قلعے کا یہ محافظ کس حال میں ہے۔ مرزا حسین بیگ ہر روز سپہ سالار کے پاس جاتا اور معظم علی کے متعلق پوچھتا لیکن کئی دن تک وہ اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ فرحت اور اس کی والدہ صبح شام معظم علی کے گھر جاتیں اور اس کی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

چند دن بعد کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ مرہٹوں نے سرحدی قلعہ فتح کر لیا ہے۔ معظم علی کے بیشتر ساتھی شہید ہو چکے ہیں اور باقی دشمن کی قید میں ہیں اور اس قسم کی افواہوں کے ساتھ معظم علی کی بہادرانہ موت کی فرضی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔

ایک دن فرحت اور اس کی والدہ حسب معمول معظم علی کے گھر گئیں۔ کچھ دیر معظم علی کی ماں کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد انھوں نے رخصت چاہی۔ معظم علی کی ماں انھیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ وہ زنا خانے سے نکل کر مکان کے مردانہ حصے کے صحن میں داخل ہو رہی تھیں کہ گلی کی طرف سے ایک سوار اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

”معظم! ماں کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی تمام حیات محنت کراٹھوں میں آگئیں۔ کچھ دیر یہ تینوں سکھتے کے عالم میں کھڑی رہیں۔

معظم علی گھوڑے سے اترا اور اسلام علیکم کہہ کر چند قدم آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں فرحت جس کے چہرے پر اب تک کئی رنگ آچکے تھے۔ اپنی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم! معظم!! ماں نے لرزتی ہوئی آوازیں کہا اور اس کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر معظم علی کا سراپنہ سینے سے لگالیا اور کہا ”بیٹا! یہ تمہاری چچی جان ہیں!“

حسین بیگ کی بیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو جمع ہو رہے تھے۔ اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور کہا ”بیٹی تم گھر جاؤ اور اپنے آبا سے کہو معظم علی آگیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

فرحت اپنا چہرہ چادر میں چھپائے ہوئے جھپکتی اور منتی دروازے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے کہا ”چچی جان آپ کے گھر میں خیریت ہے نا؟“

فرحت کی ماں نے جواب دیا ”گھر میں سب خیریت ہے بیٹا، لیکن تم نے ہم کو بہت پریشان کیا۔“

”صابر! صابر!“ معظم علی کی ماں نے نوکر کو آواز دی۔

صابر نکلیں ملتا ہوا اصطبل کے قریب کے کمرے سے باہر نکلا اور خاتین کی موجودگی کا خیال کیے بغیر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ پٹ گیا۔

معظم علی کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا ”صابر! معظم کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دو اور اس کے ابا جان اور یوسف کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو۔“

معظم علی نے کہا ”نہیں امی جان! گھوڑا باندھنے کی ضرورت نہیں، ابھی مجھے ہاھر کچھ کام ہے۔“



زحمت کی ماں نے کہا: بیٹا کہاں جا رہے ہو؟ آرام سے گھر بیٹھو، تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دن سے آرام نہیں کیا ہے۔

معظم علی نے کہنا چھی جان! میں میرمدن کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے ملاقات کے بعد شاید مجھے نواب صاحب کے سامنے حاضر ہونا پڑے۔ مجھے سیدھا دہاں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے گھر کا حال معلوم کروں۔



کوئی ایک گھنٹہ بعد معظم علی، میرمدن کے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ میرمدن نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ گرجوشتی سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھانے کے بعد کہا: معظم علی! میں کسی تہید کے بغیر تمہارے ساتھیوں کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ معظم علی نے منہم لہجے میں جواب دیا: میرے ساتھی میرجعفر کی بزدلی اور بے غیرتی کا کفارہ ادا کر چکے ہیں اور میرشد آباد کی ماؤں اور بہنوں کے لیے یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ حکومت کی بے حسی اور نااہلیت کے باعث ان کے تین سو بیٹے، بھائی اور شوہر ہلاک ہو چکے ہیں۔

”اور باتی؟“ میرمدن نے قدے وقف کے بعد سوال کیا۔

معظم علی نے جواب دیا: چالیس سپاہی دشمن کی قید میں ہیں اور باتی ایک سوساٹھ، جن میں سے قریباً پچاس زخمی ہیں۔ قلعے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ میں انہیں بردوان کے راستے میں ایک محضو مقام پر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہم نے دشمن کے ہاتھوں شکست نہیں کھائی۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حکومت نے ہمیں بے درست دیا بنا کر دشمن کے آگے ڈال دیا تھا۔ ہم نے پندرہ دن تک دشمن کے اس لشکر کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ہم سے بیس گنا زیادہ تھا اور ہمیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر کمک پہنچ جائے گی۔ میں بردوز میرجعفر کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ جہاں بارود ختم ہو رہا ہے اور ہم زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں پندرہ دن کے بعد یہ جواب ملا کہ اس قلعے کی حفاظت بے سود ہے۔

تم اگر دشمن کا محاصرہ توڑ کر نکل سکتے ہو تو بردوان پہنچ جاؤ۔

اگر یہی حکم ہمیں آٹھ دس دن پہلے مل جاتا تو اتنی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔ میرجعفر کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث ہمارے ہاتھ سے صرف ایک قلعہ ہی نہیں نکلا بلکہ اڑیسہ کے تمام علاقوں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر حکومت نے کچھ عرصہ اور اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہے کہ پورا بنگال مرہٹوں کی شکار گاہ بن جائے گا۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان حالات میں بھی مجھے میرجعفر سے چند منٹ کی ملاقات کے لیے دد دن بردوان میں ٹھہرنا پڑا۔

”تم میرجعفر سے مل کر آئے ہو؟“

ہاں دد دن تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد میں زبردستی محل کے اہل گھر گیا اور سپاہی مجھے پکار کر اس کے پاس لے گئے تھے۔

میرمدن نے کہا: ”جعفر اپنی تمام برائیوں کے باوجود بنگال کے حکمران کا رشتہ دار ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کوئی گستاخی تو نہیں کی؟“

معظم علی نے جواب دیا: اگر کسی بزدل آدمی کو بزدل کہنا گستاخی ہے تو میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ میں علی دردی خاں نے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میرجعفر ان کا رشتہ دار ہونے کے باوجود اس قابل ہیں کہ اسے فوج میں کوئی معمولی عہدہ بھی نیا جاسکے۔

میرمدن نے چند ثانیے سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: ”معظم علی! میں بھی ایک سپاہی ہوں اور موجودہ حالات میں تمہارے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ میرجعفر کے متعلق میرے خیالات تھکے خیالات سے مختلف نہیں لیکن علی دردی خاں کے سامنے اس کی شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب اسے میدان پورا اور ہنگامی کی فوجی دی جا رہی تھی تو میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ میں نے علی دردی خاں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف فوج کی کمان کے لیے اس کا انتخاب درست نہیں۔ لیکن میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہیں میرجعفر کی صلاحیتوں کے متعلق

کوئی غلط فہمی نہیں لیکن بڑے بڑے امراء کی بغاوتوں نے انہیں میر جعفر جیسے خوشامدیوں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ تم ان کے سامنے اس میر جعفر کی شکایت کرو گے جس کی نااہلیت اور بزدلی کے باعث اڑیسہ کے عوام تباہی کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میر جعفر جیب ان کے سامنے پیش ہوگا تو انتہائی غصے کی حالت میں بھی بنگال کے حکمران کا معاطہ اس شخص کیساتھ ہوگا جو بوقت ضرورت اپنے آقا کے قدموں پر گرنا جانتا ہے، وہ کہے گا: "عالی جاہ! میں آپ کا حقیر غلام ہوں۔ میں غلاموں کا پتلا ہوں۔ میری تفصیر معاف کیجئے" اور علی دردی خاں اگر اس کے الفاظ سے نہیں تو اس کے آنسوؤں سے ہزر در متاثر ہوگا اور جیب میر جعفر دیکھے گا کہ اس کے آنسو بھی رانگن گئے ہیں تو وہ محل کی بیگمات کے پاس جائے گا اور ان سے کچھ گا کہ نواب صاحب میرے دشمنوں کی باتوں میں آگئے ہیں۔ میں مظلوم ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ خدا کے لیے میری سفارش کیجئے۔ سلطنت کے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ یہ وفادار غلام نواب صاحب کے قدموں میں رہے" اور پھر چند دن بعد نواب صاحب اسے بلا کر یہ کہیں گے: "میر جعفر! ہم تمہاری سابقہ فروگزاشتیں معاف کرتے ہیں۔ لیکن آئندہ کے لیے معاطہ رہو۔ ہمیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیئے" اور وہ یہ کہے گا: "عالی جاہ! مجھے جاہ و منصب کا شوق نہیں۔ مجھے کم از کم اس وقت تک اپنی خدمت کا موقع دیکھیے، جب تک سراج الدولہ سلطنت کے کالبدار میں آپ کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا اور ایسے امراء بنگال سے ختم نہیں ہو جاتے جو آئے دن آپ کی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ معظم علی! مجھے اندیشہ ہے کہ تم نے بردوان میں میر جعفر سے یہ ضرور کہا ہوگا کہ تم علی دردی خاں کے پاس جا کر اس کی شکایت کرو گے اور مجھے یقین ہے کہ تم سے پہلے میر جعفر کے جاسوس، علی دردی خاں کو اس کا یہ پیغام پہنچا چکے ہوں گے کہ ایک سربراہ فوجان شاہد آپ کے پاس پہنچ کر میری شکایت کرنے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سنی سنی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے مجھے صفائی کا موقع دیں گے اور یہ فوجان آپ کے متعلق بھی نہایت باغیانہ خیالات کا اظہار کر چکا ہے" مرشد آباد میں

شاہی محل کے اندر اور باہر اس کے جاسوس ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مرشد آباد پہنچنے سے پہلے تمہارے متعلق اس کی ہدایات ان کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔ اب یہ سب ساتھ ملاقات کے بعد تم اگر علی دردی خاں کے پاس جا کر میر جعفر کی شکایت کرو گے، تو ایسے لوگ انہیں ذرا خبردار کریں گے کہ تم میری طرف سے آئے ہو۔

معظم علی نے بدل ہو کر کہا: "مجھے معلوم نہ تھا کہ میر جعفر کے سامنے آپ بھی بے بس ہو چکے ہیں۔"

میر مدن نے جواب دیا: "معظم علی! ہم نے بڑے حالات میں جنم لیا ہے۔ لیکن کاش ہم تمام برائیوں کے خلاف لڑ سکتے۔ موجودہ حالات میں نواب علی دردی خاں بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر رانی کے خلاف نہیں لڑ سکتے وہ ایک بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے جھوٹے جھوٹے خطرات کو نظر انداز کر دینے پر مجبور ہیں۔ اس وقت ان کی ساری توجہ مرہٹوں پر مرکوز ہے۔ میرے مشورہ پر اب انہوں نے اڑیسہ کی ہم میر جعفر کی جگہ عطاء اللہ خاں کو سوئپ دی ہے تو دو دن تک یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ آج تیسرے پہر علی دردی خاں نے فوج کے چند افسروں کا اجلاس طلب کیا ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم میر جعفر کے خلاف اپنے جذبات پر قابو رکھو گے تو میں یہ کوشش کروں گا کہ اس اجلاس میں تمہیں بھی بلایا جائے۔ تم تمام حالات سے واقف ہو اور اس اجلاس میں میر جعفر کی ذات کے متعلق کچھ کہے بغیر تمہیں پوری آزادی سے ان غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت ہوگی جن کے باعث یہ حالات پیدا ہوئے ہیں۔ میر جعفر کی اتحاد پسپائی کے متعلق ایک منہ قبل بھرے دربار میں کافی لے دے چکی ہے اور تم اس کی ذات کو ہدف ملامت بنا کر علی دردی خاں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن اگر تم گزشتہ کوآ ہیوں کی قافی کے لیے کوئی منہ توجیز پیش کر سکو تو ممکن ہے کہ اڑیسہ کے حالات کے روبہ اصلاح ہوتے ہی وہ وقت بہت جلد آبلے۔ جیب براہ اطمینان سے میر جعفر کے قماش کے لوگوں پر توجہ دے سکیں۔"

معظم علی نے کہا: "میر جعفر پہلی توجیز یہ ہوگی کہ مرہٹوں سے جنگ کے دوران میں میر جعفر



جیسے لوگوں کو فوجی معاملات میں مداخلت سے باز رکھا جائے

میرمدن مسکرایا۔ "تھیں یہ تجویز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرجعفر کو یہ ہدایات صحیحی جاچکی ہیں کہ عطاء اللہ خاں کے ساتھ پورا تعاون کرے اور عطاء اللہ خاں کو یہ اختیار دیا جا چکا ہے کہ اگر وہ کسی افسر سے مطمئن نہ ہو تو اسے سبکدوش کر دے۔"

معظم علی نے کہا: "جب مرہٹے ہمارے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور مجھے کئی دن تک میرجعفر کی طرف سے اپنے پیغامات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا تو میں نے یہ عہد کیا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی میں فوج کی لازمت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں اپنے ساتھیوں کی بے گوردکن لاشیں چھوڑ کر وہاں سے نکلنے لگا تو میں نے یہ عہد کیا کہ میں کم از کم ایک بار اور یہاں ضرور آؤں گا۔ میں عطاء اللہ خاں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن اگر آپ کو اس کی صلاحیت پر اعتماد ہے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے۔"

میرمدن نے کہا: "لیکن میرا خیال تھا تم اتنی مدت کے بعد چند دن مرشد آباد رہنا چاہو گے۔" معظم علی نے جواب دیا: "وہ قلعہ جہاں میرے ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مجھے مرشد آباد سے زیادہ عزیز ہے۔"



میرمدن سے ملاقات کے بعد معظم علی واپس گھر پہنچا تو اس کا باپ، بھائی اور حسین بیگ دیوان خانے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ محلے کے پندرہ بیس آدمی اور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سب باری باری اس سے مل گئے۔

مرزا حسین بیگ نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھالیا اور کہا: "بیٹا! ہم بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور تمہاری زبان سے اڑیسیکے حالات سننے کے لیے بے چین ہیں چند دنوں سے سرحدی علاقوں کے متعلق بہت ہی خبریں آرہی تھیں اور ہم تمہارے متعلق بہت پریشان تھے۔ میں تمام واقعات سناؤ۔"

معظم علی نے اس کے جواب میں میرجعفر کی نااہلیت، مرہٹوں کے مظالم اور سرحدی قلعے کی تباہی کی داستان مختصراً بیان کر دی۔

اتنی دیر میں محلے کے بوڑھے، بچے اور جوان جوق در جوق مکان کے اندر داخل ہوئے تھے اور صابر بلند آواز سے چلا رہا تھا: "بھئی ٹھہرو! اندر جگہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے شور نہ مچاؤ اندر مرزا صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔"

معظم علی جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا اور لوگ دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس کے ساتھ بغلیگر ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود علی، حسین بیگ اور محلے کے باقی معززین بھی کمرے سے نکل کر باہر آگئے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔ جب معظم علی صحن میں جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے کے بعد ڈیوڑھی میں پہنا تو باہر گلی میں ایک اور جھوم دکھائی دیا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک وہ ان لوگوں سے ملنے میں مصروف رہا۔ اتنی دیر میں آصف بیگ اور افضل بیگ بھی آگئے، وہ معظم علی کو دیکھتے ہی جھوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کے ساتھ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے اور معظم علی دیوان خانے کی بجائے بالائی منزل کے ایک کمرے میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ باقی کر رہا تھا۔

اگلے دن سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہو چکی تھی کہ معظم علی، عطاء اللہ خاں کے ساتھ اڑیسیہ کی ہم پر جارہا ہے اس کے بھائی اور حسین بیگ کے دونوں بیٹوں نے بھی اس ہم کے لیے اپنے نام پیش کیے تھے۔ لیکن مرشد آباد کے فوجدار نے صرف آصف بیگ کو معظم علی کا ساتھ دینے کی اجازت دی ہے۔

تیسرے دن مرزا حسین بیگ کے ہاں معظم علی کی دعوت تھی، جس میں مرشد آباد کے قریب ساٹھ املاہ اور بڑے بڑے افسر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب مرزا حسین بیگ محلے کے چند معززین کے ساتھ ڈیوڑھی سے باہر کھڑا تھا اور اس کے محل کے اندر وسیع سامان کے نیچے جمع

ہونے والے مہمانوں کی نگاہیں اندرونِ صحن کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک نوجوان لڑکا، جس کے دائیں بائیں میرمدن، راجہ رام موہن لال، عطاء اللہ خاں اور مرشد آباد کے فوجدار تھے۔ دروازے سے نمودار ہوا۔ ان کے پیچھے مرزا حسین بیگ اور محلے کے چند اور معززین تھے۔ نوجوان خوش وضع لڑکا، جس کی تباہیڑوں سے مرصع تھی، ایک شاندار تکنت کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور سائبان کے نیچے برآمد ہونے والے مہمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ لڑکا سلطنتِ بنگال کا ولی عہد سراج الدولہ تھا۔ وہ سی کے ساتھ بے تکلفی سے مصافحہ کرتا اور کسی کو ہاتھ کے اشارے یا مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دولک میں مہمان سراج الدولہ کے بعد جس شخص کی طرف سب سے زیادہ دیکھ رہے تھے وہ معظم علی تھا جو اس کے بائیں ہاتھ عطاء اللہ خاں اور حسین بیگ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسین بیگ اٹھا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر میں سراج الدولہ، میرمدن اور دوسرے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سراج الدولہ نے اس کی تقریر کے جواب میں کہا: "اس وقت ہم سب کو معظم علی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس کی خاطر اس شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اس نوجوان کی موت افزائی کا موقع ملے جس نے بنگال کی فوج کے لیے جرات، ہمت، بہادری اور وفاداری کی قابلِ فخر مثال قائم کی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ جب اڑیسہ کی مہم سے مرشد آباد کی فوج واپس آئے تو مرزا صاحب اس طرح کی کئی اور دعوتوں کی ضرورت محسوس کریں۔"

بنگال کی فوج اڑیسہ میں رہتوں پہلے رہے شکستیں دینے کے بعد انہیں مغرب کی طرف دھکیل رہی تھی۔ سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر عطاء اللہ خاں کی فوجیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ایک شاہ معظم علی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پڑاؤ میں داخل ہوا اور گھوڑے سے

اترتے ہی سیدھا سپہ سالار کے نیچے میں پہنچا۔ عطاء اللہ خاں اپنے کاتب سے کوئی مراسلہ کھنڈا ہوا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھتے ہی کہا: "میں دودن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے بہت دیر لگائی!" معظم علی نے جواب دیا میں مرہٹوں کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ اب شمال کے تمام جنگلات ان کے وجود سے پاک ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اگر پانچ سو قیدیوں کو ساتھ لائے گا مسئلہ ہوتا تو میں دودن قبل یہاں پہنچ جاتا۔ قیدیوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سرحدی قلعے میں اس وقت مرہٹوں کے صرف ایک ہزار سپاہی موجود ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی تاجر کے بغیر قلعے پر حملہ کر دیا جائے!

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "قلعے پر حملہ کرنے کے لیے تمہیں چند دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کل مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب کی طرف مرہٹوں کا ایک لشکر جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور میں آج علی الصباح میرے جعفر کی قیادت میں پانچ ہزار سواروں کو اس طرف روانہ کر چکا ہوں۔"

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا: "میر جعفر کو ایسی مہم پر بھیجنے سے پہلے اگر آپ دشمن کو غیر مسلح کر کے دہشتوں کے ساتھ باندھ دیتے تو شاید یہ مہم کامیاب رہتی۔"

عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: "میر جعفر اس مہم پر چلنے کے لیے مسرت تھا اور میں اسے گزشتہ بنامی کا داغ دھونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمہارا دوست آصف بیگ میر جعفر کے ساتھ جا چکا ہے اور مجھے میر جعفر سے زیادہ اس کی سپاہیانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔ میں اس مہم پر تمہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن تم دیر سے پہنچے ہو۔"

معظم علی نے کہا: "میر جعفر کی رفاقت کے لیے آصف بیگ جیسے جبری نوجوان کا انتخاب صحیح نہیں تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اس مہم پر جانے کی اجازت دی جائے اور میرا ارادہ ہے کہ اس مہم سے فارغ ہو کر واپس آنے کی بجائے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا جائے۔"



عطار اللہ خاں نے جواب دیا: اگر تمہیں میرے جگر کی کھان میں مرنے پر کوئی اعتراض نہیں تو میں خوشی سے تمہاری درخواست منظور کرتا ہوں:

معظم علی نے کہا: میں ایک سپاہی ہوں اور اگر میرے جگر نے کوئی بہت بڑی حماقت نہ کی تو ہمارے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا:

عطار اللہ خاں نے ایک نقشہ اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا: بیٹھ جاؤ:

معظم علی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور عطار اللہ خاں نے نقشہ پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا: یہ مرہٹوں کا پڑاؤ ہے۔ اور میں نے میرے جگر کو یہ راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ کل طلوع آفتاب سے پہلے وہ دشمن پر حملہ کرے گا۔ میرے خیال میں تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ تمہیں تازہ دم سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے لیے پانچ سو سولہوں کو تیاری کا حکم دیتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنی رہنمائی کے لیے اس نقشہ کی نقل تیار کرو:

معظم علی نے جواب دیا: یہ نقشہ مجھے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ یہ دیکھتے مرہٹوں کے پڑاؤ سے صرف تیس میل دور دروہ قلعہ ہے۔ جہاں میں کئی برس گزار چکا ہوں۔ ان جنگلوں میں میں نے بار بار مرہٹوں کا تعاقب کیا ہے۔ مرہٹوں کے پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلے وادیاں اور ندیاں اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ میں شاید حملے سے پہلے نہ پہنچ سکوں:

عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے یقین ہے کہ تم وقت پر پہنچ جاؤ گے:

معظم علی سپہ سالار کے ساتھ خیمے سے باہر نکلا اور قریباً نصف گھنٹہ بعد اس کی قیادت میں پانچ سو سوار شمال مغرب کا رخ کر رہے تھے:



اگلی صبح چند ٹیلے عبور کرنے کے بعد معظم علی کو اپنے سامنے ایک ندی کے کنارے خیموں کی ایک قطار دکھائی دی۔ مسلح سپاہیوں کی چند ٹولیاں ان خیموں کے درمیان ادھر ادھر گشت

کر رہی تھیں۔ وہ گھوڑا بھگاتا ہوا سپاہیوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچا۔ ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر سوال کیا: تم نے رات کے وقت یہاں پڑاؤ ڈالا تھا؟

جی ہاں:

”فوج کو یہاں سے روانہ ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ:

”رات کے وقت دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کوئی اطلاع ملی تھی؟“

جی ہاں! رات کے وقت ہمیں پتہ چلا تھا کہ دشمن یہاں سے کوئی تین کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔“

”اور وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں؟“

جی ہاں! اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی تھی کہ جنگل میں فوج کو اس سے آگے پیدل پیش قدمی کرنی چاہیئے یا گھوڑوں پر۔ اصف بیگ کا خیال تھا کہ فوج کو اس سے آگے پیدل جانا چاہیئے لیکن میرے جگر نے یہ کہتے تھے کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے:

معظم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: ”میرے جگر یہ سمجھتے ہیں کہ بھاگنے کے لیے پاؤں کی بجائے گھوڑے زیادہ کام دیتے ہیں!“ پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوا: ”تم میں سے پچاس آدمی میرے ساتھ پیدل چلیں اور دوسروں ندی کے کنارے درختوں اور پتھروں کی آڑ میں مورچے بنا لیں۔ باقی تمام گھوڑوں کو لے کر ان ٹیلوں کے پیچھے چھپ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جگر دشمن کو بہت جلد یہاں لے آئیں گے۔“

پھر وہ پڑاؤ کے محافظ کی طرف متوجہ ہوا: ”میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم یہاں سے یہ خیمے اکٹھا کر دو اور رسد کا ندی سامان ان ٹیلوں کے پیچھے لے جاؤ۔“

نوجوان افسر نے گہرا کر کہا: لیکن جناب! میرے جگر کے حکم کے بغیر.....:

معظم علی نے جھنجھلا کر کہا: "اگر تم نے رات کے وقت اس جگہ پڑاؤ ڈالا تو مجھے یقین ہے کہ قتلوی دیر بعد میرے جعفر کو حکم دینے کا ہوش نہیں ہوگا اور میں اس کے سامنے تمہیں حکم عدلی کی مرزا دے سکوں گا۔"

"لیکن جناب میں نے کوئی حکم عدلی نہیں کی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میرے جعفر!"

معظم علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں دس منٹ کے بعد اس جگہ پڑاؤ کا کوئی نشان نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"بہت اچھا جناب!"

اچانک جنگل میں دد سے بند دقوں کے دھماکے سنائی دیئے اور معظم علی نے گھوڑے سے کود کر اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا "بہادو! جلدی کرو، میرے جعفر میری توقع سے پہلے واپس تشریف لا رہے ہیں۔"

پچاس سپاہی گھوڑوں سے اتر کر معظم علی کے پیچھے ندی میں گھس پڑے اور گھٹنے گھٹنے پانی میں سے گزرنے کے بعد جنگل میں غائب ہو گئے۔ کوئی ایک میل جنگل میں چلنے کے بعد انہیں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی معظم علی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور وہ اس کے دائیں بائیں بکھر کر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ بعد جنگل کی فوج کے چند سوار دکھائی دیئے جن میں سے ایک میر جعفر تھا۔

"ٹھہریے! ٹھہریے!!" معظم علی نے دونوں ہاتھ بند کر کے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ درختوں اور جھاڑیوں سے بچتے ہوئے نکل گئے۔ پھر چند دستے نمودار ہوئے۔ ایک افسر نے معظم علی کو دیکھ کر اپنا گھوڑا روکا اور معظم علی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے سوال کیا: "کیا ہوا؟ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟"

مرہٹوں نے ہم پر راستے میں حملہ کر دیا تھا۔ ہماری بیشتر فوج ان کے گھیرے میں آچکی ہے۔"

معظم علی نے چلا کر کہا: "لیکن تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"یہ میرے جعفر کا حکم ہے۔"

"مرزا آصف بیگ کہاں ہے؟"

"وہ حملے کے وقت اپنی ایک ہزار فوج کے ساتھ گھوڑوں سے اتر کر جنگل میں گھس گیا تھا اور اب معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرے جعفر اس سے بہت خفا ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر آصف کے ایک ہزار جانا باز ابھی تک جنگل میں ہیں تو مرہٹے کھلے میدان میں تم سے لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ تم تمام سواروں کو اس جگہ روکنے کی کوشش کرو، میں جوابی حملہ کرنا چاہتا ہوں!"

افسر نے جواب دیا: "لیکن میرے جعفر اسے حکم عدلی سمجھیں گے۔"

معظم علی نے گرجتی ہوئی آوازیں کہا: "میرے جعفر مرشد آباد پہنچنے سے پہلے دم نہیں لیں گے اور تم اس وقت میری کمان میں ہو۔ اگر کسی سوار نے آگے جانے کی کوشش کی تو میں اپنے سپاہیوں کو حکم دوں گا کہ وہ اسے بلا توقف گولی مار دیں۔"

افسر نے کہا: "اگر آپ یہ ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو میں بھاگنے کی بجائے آپ کی قوت میں جان دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں کوئی سات سو سوار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ افسر نے انہیں حکم دیا اور وہ جنگل میں پسپا کر چھپے آنے والے ساتھیوں کو روکنے لگے اور قتلوی دیر میں چار ہزار سپاہی وہاں جمع ہو گئے۔ معظم علی نے آٹھ سو سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے گھوڑے ندی کے پار لے جائیں اور باقی فوج کو چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے جنگل میں پیش قدمی شروع کر دی۔ راستے میں سپاہیوں کے چند دستے منتشر دے ان کے ساتھ ملتے گئے۔ جنگل میں چند مقامات پر مرہٹوں کے اکا دکا دستوں کیساتھ ان کا تصادم ہوا لیکن وہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ نکلے۔ کوئی دو گھنٹے بعد انہیں ایک طرف بند دقوں کے دھماکے اور لڑنے والوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ وہ گھنٹی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک نصف دائرہ میں آگے بڑھے۔



معظم علی کو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ دکھائی دیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ بھاگتا ہوا ٹیلے کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی جھیل دکھائی دی جس کے کناروں پر آصف بیگ کے سپاہیوں اور مرہٹوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ان کی آن میں وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر اپنی فوج کو نئی ہدایات دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنگال کا لشکر دائیں اور بائیں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑے کرھیل کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد مرہٹوں پر حملہ کر چکا تھا۔ مرہٹوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ حملہ جس قدر شدید تھا۔ اسی قدر غیر متوقع تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معظم علی کے سپاہی جھیل کے ارد گرد دشمن کی لاشوں کے انبار لگا چکے تھے اور مرہٹے انتہائی سراسیمہ کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

قریباً پالیس منٹ کے بعد میدان صاف ہو چکا تھا۔ شکست خوردہ دشمن کے کوئی ڈیڑھ سو آدمی جو بدحواسی کی حالت میں جھیل میں کودنے کے بعد ایک جھوٹے سے پاؤ پر جمع ہو گئے تھیاد ڈال چکے تھے۔ جنگال کے ڈیڑھ سو سپاہی زخمی اور اسی شہید ہوئے۔ آصف بیگ جس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے پڑا گرا رہا تھا۔ چند سپاہی اور انہر اس کے گرد کھڑے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا پسپا اور آصف کے قریب بیٹھ گیا۔

آصف نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”دوست تو ذرا دیر سے آئے۔“

معظم علی نے ارد گرد کھڑے ہونے والے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”جراح کو بلاؤ۔ جلدی کرو!“

آصف بیگ نے ڈوبتی ہوئی آوازیں کہا: ”جراح کی ضرورت نہیں! تم اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔ اند میں تھوڑی دیر پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں تم سے نہیں کہہ

سکا۔ پھر اس نے ارد گرد جمع ہونے والوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ادھر ادھر بٹ گئے۔

”معظم علی! آصف نے قدرے وقف کے بعد کہا: مجھے اسی جگہ دفن کر دینا اور اباجان سے یہ کہنا کہ میں نے تمام زخم سینے پر کھائے تھے۔ فضل کو میری طرف سے نصیحت کرنا کہ وہ کبھی کسی بزدل آدمی کی قیادت میں لڑنے کی غلطی نہ کرے۔ میں اپنی فوج کے سپاہی تھیں سوچتا ہوں۔ اور میرے جو ساتھی شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے لواحقین کے لیے حکومت سے اعانت حاصل کرنا تمہارا فرض ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی دن اڑیسہ کے گورنر بنو اور پھر میری قبر پر اگر یہ کہو: آصف! میں تمہیں بھولا نہیں۔ اباجان کی یہ خواہش تھی کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی کر دی جائے۔ رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آج ہی ڈھاکہ کے کسی ادبچے گھرانے سے میرے لیے پیغام آیا ہے۔ تمہارے متعلق میرے دل میں ایک خواہش تھی۔ لیکن کاش میں یہاں آنے سے پہلے اباجان کو کچھ بتا سکتا۔ معظم علی! تمہیں ایک بھائی کے منصبے ایسی باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن اب تمہیں شاید یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کہ میں اپنے دل میں فرحت کا مستقبل تمہارے ساتھ وابستہ کر چکا تھا۔ معظم! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ امی جان کسی اور جگہ اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کے دل کا حال معلوم تھا اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اباجان کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ اس کے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کریں گے۔ لیکن اگر ان کا ارادہ کچھ اور ہو تو انہیں استاذ در بتا دینا کہ فرحت کے متعلق میری خواہش یہ تھی۔ یہ باتیں میں نے اس لیے کہی ہیں کہ فرحت کے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔ تمہیں چاہتی ہے جب تم اڑیسہ کے محاذ پر جا رہے تھے اس کے آنسو مجھے بھانسنے کے لیے کافی تھے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ننھی بہن کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔“

آصف نے یہاں تک کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

معظم علی نے ایک سپاہی کو پانی لانے کے لیے کہا اور اس نے اپنی چھانگ کھول کر آگے

کردی۔ معظم علی نے آصف کی گردن کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کے چند گھونٹ پانے کے بعد اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

آصف بیگ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نجیت آواز میں کہا: ”میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا آخری زرخیز پورا کر چکا ہوں۔“

کوئی ایک گھنٹہ تک آصف کی یہ حالت رہی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آتا اور معظم علی سے چند باتیں کرنے کے بعد پھر آنکھیں بند کر لیتا۔

معظم علی میں بات کرنے کی طاقت نہ تھی وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوج کے سپاہی ان کے گرد سر جھکائے کھڑے تھے۔ آصف بیگ نے آخری بار آنکھیں کھولیں اور آسمان کی نیلیوں فضاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈوبی آواز میں ”ابا جان“، ”امی جان“، ”افضل“ اور ”زحمت“ کے الفاظ چند بار دہرائے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

معظم علی نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر کچھ دیر اس کے سینے کے ساتھ کان لگانے کے بعد ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ کہہ کر اس کا سر زمین پر رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اور جنگ کی خاموش فضا میں ہلکی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

معظم نے شہیدوں کو دفن کرنے کا حکم دیا اور میر جعفر کو لڑائی کے واقعات کی اطلاع دینے کے لیے ایک افسر اور چند سپاہی روانہ کر دیئے۔



نہی کے کنارے میر جعفر بڑی بے چینی کے ساتھ فوج کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا: ”نوجوان تھا یہ اقدام میری خواہش کے مطابق نہ تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ سر ہٹوں کے ساتھ کھلے میدان میں جنگ کی جائے۔ لیکن میں

تمہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”سر ہٹوں کو آپ کے تعاقب کے لیے کھلے میدان میں آنے کی ضرورت نہ تھی۔ بالخصوص اس حالت میں جب کہ وہ آصف بیگ کے ایک ہزار سپاہیوں پر اپنی تلواروں کی تیزی آزماسکتے تھے۔“

میر جعفر نے کہہ ”مجھے آصف بیگ کی موت کا افسوس ہے۔ لیکن اگر وہ میری حکم برداری نہ کرتا تو یہ صورت حالات پیدا نہ ہوتی۔“

لیکن اگر آپ بھی اس کی طرح جان دینا پسند کرتے تو یہ صدمت حالات پیدا نہ ہوتی۔ میر جعفر کا چہرہ سخت سے تنہا اٹھا۔ لیکن اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس نہ کی۔

معظم علی نے قتلے توقت کے بعد کہا: ”میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کسی تاخیر کے بغیر یہاں سے چنکر کوس دور ایک قلعے پر حملے کی اجازت دی جائے۔“

”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم پہلے پٹاؤ میں جا کر اس مہم کے لیے عطاء اللہ کی اجازت حاصل کرو۔“

”میں عطاء اللہ خاں سے اجازت لے چکا ہوں۔ مجھے صرف آپ کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس جنگ سے شکست کھا کر بھاگنے کے بعد مرے اس قلعے کا رخ کریں گے۔ اس لیے میں کسی تاخیر کے بغیر شہ قہمی کرنا چاہتا ہوں۔“

میر جعفر نے کہا: ”میں اس مہم میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

”لیکن اس چھوٹی سی مہم کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فوج کے ڈیڑھ ہزار سپاہی ساتھ لے جانے کی اجازت دیں۔“

”نہیں، میں خود بھی چلوں گا۔“

”بہت اچھا! لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مرزا حسین بیگ کو آصف کی موت کی اطلاع



دینے کے لیے کوئی ایلی رونا کر دیں :

اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اب بتاؤ ہمیں کب یہاں سے رونا ہونا چاہیے ؟  
”ابھی اسی وقت !“ معظم علی نے جواب دیا :

اگلے دن غروب آفتاب سے قبل بنگال کی فوج کسی شدید مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سرحدی قلعے پر قبضہ کر چکی تھی۔ میر جنر کی حیثیت اس مہم میں ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ اور فوج کی کمان عملاً معظم علی کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن فتح کے بعد وہ عطاء اللہ خاں اڑیسہ کے صوبیدار، میرمدن اور علی دودی خاں کے نام اس قسم کے خطوط لکھ رہا تھا۔  
”خدا نے میں بہت بڑی فتح دی ہے۔ ہم نے اڑیسہ کی سرحد پر مرہٹوں کا سب سے بڑا مستقر چھین لیا ہے۔ اب مجھے امید ہے کہ دشمن ایک مدت تک اپنے زحسم چاٹتا رہے گا۔“

علی دودی خاں کے نام اس کے خط کے آخری فقرے یہ تھے : ”اس حقیر غلام نے اپنی بساط کے مطابق حضور پرورد کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرشد آباد پہنچ کر حضور کی قدم پوی کا شرف حاصل کروں اور حضور کو یہ خوشخبری سناؤں کہ اڑیسہ کی سرزمین دشمن کے زور سے آزاد ہو چکی ہے۔“

تیسرے دن عطاء اللہ خاں باقی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس نے کون درمختہ قلعے میں قیام کیا۔ اس عرصے میں اسے شمال مغرب کے سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کے آڑھ ہونے کی خبر ملی اور اس نے معظم علی کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ کوچ کا حکم دیا۔

دس دن بعد معظم علی واپس آیا اور اس نے اطلاع دی کہ شمال مغرب کے سرحدی علاقے مرہٹوں کے دھڑ سے پاک ہو چکے ہیں۔ عطاء اللہ خاں نے معظم علی کو قلعے کی حفاظت پر متین کر کے نکلی کی طرف کوچ کیا۔

تین ماہ کے بعد معظم علی نے دو بیٹے کی چھٹی لی اور مرشد آباد روانہ ہوا :

ایک روز دوپہر کے وقت مرزا حسین بیگ بخار کی حالت میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اس کی بیوی، افضل اور فرحت اس کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے معظم علی کی آمد کی اطلاع دی۔ افضل جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ فرحت برابر کے کمرے میں چلی گئی اور نیم دا دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، افضل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ حسین بیگ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افضل کی والدہ بڑی شکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

معظم علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا : ”چا جان ! مجھے انہوں سے کہیں آخری منزل تک آصف کا ساتھ نہ دے سکا۔“

”بیٹھ جاؤ بیٹا ! حسین بیگ نے اس کی طرف پدرلہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآخر حسین بیگ نے مہر سوت توڑی۔ معظم علی اس کی قبر دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا، لیکن بیماری کے باعث سفر کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ لیکن میری یہ خواہش تھی کہ اس کی شہادت کے تمام واقعات تمہاری زبانی سنوں :“

معظم علی نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کر دیئے۔ جب وہ آصف کی موت کی تفصیلات سنا رہا تھا تو اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ فرحت اسے متعلق رہا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ آخری لمحات میں آصف بار بار اپنی بہن کو یاد کرتا تھا۔

اس کے بعد معظم علی صبح شام حسین بیگ کی تیمارداری کے لیے جاتا اور کئی کئی گھنٹے

اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مرشد آباد میں اس نے ابھی کوئی بیس دن گذارے تھے کہ اسے میردن نے اپنے پاس بلایا اور کہا: "معلم علی! سرحد کے حالات ٹھیک نہیں۔ مرہٹوں نے پھر سراٹھایا ہے اور جاسوسوں نے علی دردی خاں کو اطلاع دی ہے کہ عطار اللہ خاں اور میر جعفر کلک میں بیٹھ کر حکومت کے خلاف کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً سرحدی قلعے میں پہنچ جاؤ۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ یہ لوگ مرہٹوں کے ساتھ کوئی ساز باز نہ کر سکیں۔"

اگر حالات ایسے ہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا۔

میرمدن نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور معلم علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ تمہارے نئے عہدہ کے متعلق علی دردی خاں کا حکم نامہ ہے۔ تمہیں اڑیسہ کے نائب فوجدار کی حیثیت میں سرحدی اضلاع کا محافظ مقرر کیا گیا ہے۔ تمہاری کمان میں مستقل طور پر دو ہزار سپاہی دیئے گئے ہیں اور کلک کے صوبیدار کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ سرحد پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے کے لیے سرحدی خزانہ سے مطلوبہ رقم ادا کردی جائے۔ آج تمہارے لیے کوچ کی تیاری کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کل صبح تڑکے روانہ ہو جاؤ۔ عطار اللہ خاں کو یہ حکم بھیج دیا جائے گا، کہ وہ مزید ایک ہزار سپاہی تمہاری کمان میں دے دے۔"

میرمدن سے ملاقات کے بعد معلم علی نے گھر پہنچا تو اس کی والدہ بالا خانہ کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

معلم علی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "امی جان! میری چھٹی منسوخت کردی گئی ہے اور میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں۔"

ماں نے پریشان ہو کر کہا: "بیٹا تمہیں کسی خطرناک مہم پر تو نہیں بھیجا جا رہا ہے؟"

"نہیں امی جان! مجھے اڑیسہ کے سرحدی اضلاع کا نائب فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔"

"نائب فوجدار؟" ماں نے چونک کر سوال کیا۔

ہاں امی جان! کیا آپ کے خیال میں نائب فوجدار بہت بڑا ہوتا ہے؟

نہیں بیٹا! میں تو دعا کیا کرتی ہوں کہ تم کسی دن بنگال کی فوج کے سپہ سالار بنو۔

تمہارے آبا جان یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے۔ ہاں میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گئی تھی۔ آصف کی موت کی خبر آنے سے چند دن پہلے ڈھاکہ کا کوئی بہت بڑا رئیس، جو مرزا حسین بیگ کا رشتہ دار ہے، اپنی بیوی کے ساتھ ان کے یہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کے لیے فرحت کا رشتہ مانگتے تھے۔ حسین بیگ کی بیوی کی یہی خواہش تھی کہ فرحت کی ملگنی ٹاں کر دی جائے لیکن مرزا صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب آصف واپس آئے گا تو میں اس کے ساتھ ڈھاکہ جاؤں گا، اور لڑکے کو دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔ بیٹا! میں کبھی کسی یہ سوچا کرتی تھی کہ فرحت میری بہو بنے گی لیکن ایک دن میں نے تمہارے ابا سے ذکر کیا تو وہ مجھ پر برس پڑے کہنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہاں سے ٹھکانا چاہتی ہو۔ مرزا صاحب کا یہ احسان قبول ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس قدر مہربانی سے پیش آتے ہیں تمہیں معلوم نہیں کہ وہ خاندان جس نے فرحت کا رشتہ مانگا ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو گاؤں کا مالک ہے، پھر مہدی اگر ملتی حیثیت ہوتی ہے تو مرزا حسین بیگ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی بلادی سے باہر لڑکی کا رشتہ کریں گے۔ اگر تمہارے آبا جان منع نہ کرتے تو میں شاید فرحت کی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھتی۔ فرحت بہت اچھی لڑکی ہے، اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ میری بہو بنے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہاری ترقی کے لیے بہت دعا کیا کرتی ہوں کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ مرزا صاحب تم سے بلاوجہ اس قدر محبت نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فرحت کے متعلق اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رکھا ہو اور وہ اس دن کا انتظار کر رہے ہوں، جب تم اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر اپنے خاندان کے لوگوں کی مہم کی دعویٰ کر سکو۔ ورنہ فرحت کے لیے مکھن کے یک بہت بڑے گھرانے کا رشتہ بھی آیا تھا اور مرزا صاحب نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔"



”امی جان!“

”کیا ہے بیٹا؟“

”کچھ نہیں امی جان۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے آپ کو بھائی یوسف کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔“

ماں نے جواب دیا: یوسف کے لیے تین رشتہ آئے ہیں۔ لیکن وہ تینوں لڑکیاں مجھے پسند نہیں۔ عبد اللہ خاں کی لڑکی مجھے پسند تھی۔ لیکن وہ یہیں۔ اے کلکتہ جا چکے ہیں۔ تمہارے آبا جان نے کئی بار وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر انہیں فرصت نہیں ملی۔ پچھلے مہینے ان کا خط آیا تھا کہ وہ اس سال حج کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ حج سے واپس آئیں گے تو میں تمہارے آبا جان کو ضرور بھیجوں گی؟

معظم علی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ ماں نے پوچھا۔

”مرزا صاحب کے پاس۔“

دروازے کے قریب بیچ کر معظم علی نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا:

”امی جان! بیچ بتائیے آپ کو فرصت بہت پسند ہے؟“

”ہاں بیٹا!“

”لیکن امی جان میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“

”جھوٹا کہیں کا؟“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور معظم علی ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

پچھٹا باب

PDFBOOKSFREE . PK

عطار اللہ خاں کنگ کے قلعے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ عطار اللہ خاں نے کہا: مجھے کل ہی تمہارے متعلق حکم ملا تھا۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا نیا عہدہ اڑیسہ کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟

”اگر فوج تیار ہے تو میں کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”فوج کے لیے چند دن تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ میں جو دستے تمہاری کمان میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ بردوان اور میدنا پور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں آج ہی انہیں حکم بھیجتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”سرحدی علاقوں پر مرہٹوں کی تازہ سرگرمیوں کے پیش نظر میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ سپاہیوں کو وہاں سے سیدھا سرحدی قلعے میں پہنچنے کا حکم بھیج دیں۔ میں کل علی البصیح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”بہت اچھا۔ میں ابھی انہیں حکم بھیج دیتا ہوں۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔ میں نے میرے جھڑے آپ کی ترقی کا ذکر کیا تھا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔“

”میرے جھڑے یہاں ہیں؟“ میرا تو خیال تھا کہ وہ بردوان میں ہوں گے۔“

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: "وہ ایک مزدوری مشورے کے لیے یہاں آئے ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان سے خوش نہیں۔ کچھ آپ مرشد آباد میں حضور نواب صاحب سے ملے تھے؟"

میں نے: "معظم علی نے جواب دیا: میں دلوں صرف میرمدن سے ملا تھا۔"

اچھا یہ بتائیے آپ نے میرمدن سے میرجعفر کے متعلق کوئی بات کی تھی؟

"نہیں ان کے ساتھ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔"

عطار اللہ خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا: "میرجعفر کا خیال ہے کہ دربار میں کچھ نصیر امراء ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے بھی خبردار کیا ہے کہ مرشد آباد میں تمھارے خلاف بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی ہیں۔"

"میرا تو یہ خیال ہے کہ حکومت مرہٹوں کے خلاف آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے تاہم اگر آپ بڑا دماغ ہیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"مجھے آپ جیسے شخص دوستوں کے نیک مشوروں کی ضرورت ہے۔ کچھ؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرجعفر کے متعلق محتاط رہیں۔ میرجعفر اگر کوئی غلطی کریں تو ان کا سب سے بڑا سختی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بنگال کے حکمران کے رشتہ دار ہیں۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر میرجعفر کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا کہ میرجعفر مجھے بہکا سکتا ہے؟"

معظم علی نے پریشان ہو کر جواب دیا: "میں نے یہ نہیں کہا کہ میرجعفر آپ کو بہکا سکتا ہے۔ میں نے صرف یہ کہہ کر آپ کو محتاط رہیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

عطار اللہ چند ثانیے غور سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد بولا: "معظم علی! میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ اگر مرشد آباد میں میرے دشمن میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں تو مجھے آگاہ کرنا تمھارا فرض ہے۔"

"مجھے آپ کے خلاف کسی سازش کا علم نہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس قدر پریشان ہوں گے تو میں آپ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔ میرجعفر کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ بنگال میں ہر سازش سب سے پہلے ان کے دماغ میں جنم لیتی ہے۔ وہ چند جاہ پسندوں کو پہلے حکومت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں اور پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے علی وردی خاں کو باخبر کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کچل دی جاتی ہے۔ چنانچہ مرہٹوں اور ان کے ساتھ چند بے گناہ مارے جاتے ہیں اور میرجعفر کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اپنی انتہائی نااہلی کے باوجود وہ حکومت کے لیے ایک کارآمد آدمی ہیں۔ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب علی وردی خاں کو امراء کی آئے دن کی بغاوتیں اسی قدر بدل کر دیں گی کہ انھیں میرجعفر کے سوا اپنا کوئی خیر خواہ نظر نہ آئے گا اور یہ دن بنگال کی تاریخ کا بدترین دن ہوگا۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میں ایک سپاہی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ میرجعفر کیا کرنا چاہتا ہے اور علی وردی خاں اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔"

"ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور اس نے عطار اللہ خاں سے کہا: "میرجعفر تشریف لائے ہیں۔"

معظم علی نے اٹھ کر کہا: "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"بہت اچھا۔" عطار اللہ خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "آپ میرے مکان پر جا کر آرام کریں۔"

میرجعفر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عطار اللہ خاں کے ساتھ مصافحہ کرنے کے



بعد معظم علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ کب آئے؟"

"میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔"

"تشریف رکھیے!" میر جعفر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"نہیں، اب اجازت دیجیے!"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میر صاحب! یہ بہت تکے ہوئے ہیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ہم شام کے وقت باتیں کریں گے۔"

پھر وہ سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "تم انہیں میرے مکان پر چھوڑ آؤ۔"

معظم علی سپاہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میر جعفر اور عطار اللہ خاں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میر جعفر نے کہا: "اس نوجوان کے متعلق آپ کو بہت محاط رہنا چاہیے۔ یہ میردن کا خاص آدمی ہے۔"

عطار اللہ خاں نے کہا: "میں اسے جانتا ہوں اور آپ نے کل جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ وہ کسی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ معظم علی کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ حکومت کے جاسوس ہمارے متعلق کافی چوکس ہیں۔ معظم علی آپ کو میرا دشمن سمجھتا ہے اور اس نے مجھے آپ کے متعلق خبردار رہنے کا مشورہ دیا ہے۔"

میر جعفر کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ "آپ نے کہیں اسے اعتماد میں لینے کی کوشش تو نہیں کی؟"

نہیں میر صاحب! میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے عزائم کے متعلق کس حد تک باخبر ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مرشد آباد میں میرے متعلق کوئی خطرناک اطلاع نہیں پہنچی۔ تاہم یہ آپ کی برہمگی ہے کہ آپ کو ہر جگہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمیں اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ فوج کے افسر میرے ساتھ ہیں۔ صوبیدار نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا۔ تو دقت آنے پر اس کے گھر

کا ہمارو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نوجوان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر اسے بروقت ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ میرے نزدیک ہر آدمی کے ضمیر کی ایک قیمت ہے۔ لیکن معظم علی اس سے مستثنیٰ ہے، وہ پوری قوت کے ساتھ ہماری مخالفت کرے گا اور سرحدی اضلاع کی چوکیوں کے کماندار کی حیثیت سے اس کی مخالفت ہمارے لیے کافی مشکلات پیدا کر دے گی۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سرحد تک پہنچنے کا موقع دیا جائے؟"

"نہیں، یہ ضروری نہیں۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن موجودہ حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔"

"ہم اس پر ہاتھ ڈالنے بغیر اسے سرحد تک پہنچنے سے روک سکتے ہیں۔ میر حبیب کا چلی اگر دلپس نہیں چلا گیا تو اسے یہ پیغام دے کر روانہ کر دیجیے کہ معظم علی کل صبح یہاں سے روانہ ہوگا اور یہ وہی نوجوان ہے جس نے مرزا حسین بیگ کی حویلی کی حفاظت کی تھی۔ آپ اسے یہ بھی بتادیں کہ وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہوگا۔ مرشد آباد سے صرف آٹھ سپاہی اس کے ہمراہ آئے ہیں اور یہی اس کے ساتھ یہاں سے جائیں گے۔ کلک اور سرحدی علاقے کے درمیان کئی مقامات ایسے ہیں۔ جہاں میر حبیب کے آدمی اس کو آسانی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر یہ تجویز کامیاب ہوگئی تو ہمارے راستے سے ایک پتھر مٹ جائے گا اور ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔"

میر جعفر نے کہا: "لیکن وہ فوج کے بغیر یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا؟"

عطار اللہ خاں نے جواب دیا: "میں اُسے بتا چکا ہوں کہ اس کے حصے کی فوج بردوان اور

میزانپور کے درمیان پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔"

میر جعفر نے کہا: "آپ میری توقع سے زیادہ دو رائے ہیں۔"

عطار اللہ خاں نے مسکرا کر کہا: "میر صاحب! یہ سب آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

اگلے روز صبح کی نماز کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے سے باہر

نکل رہے تھے کہ میر جعفر دروازے کے قریب ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”معظم علی ٹھہرو!“ اس نے اپنا ہاتھ بند کرتے ہوئے کہا۔

معظم علی نے گھوڑا روکا۔ میر جعفر نے کہا: ”مجھے تمہاری فرض شناسی کا اعتراف ہے لیکن میرے خیال میں یہ بہتر ہوتا کہ تم فوج کو ساتھ لے کر جاتے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر راستے میں تمہیں کوئی خطر پیش آیا تو یہ اٹھ آدمی تمہاری حفاظت کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”میری حفاظت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں اور میں فوج کے انتظار میں یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”بہر حال تمہیں راستے میں بہت عطا رہنا چاہیے۔ گزشتہ چند دنوں میں مرہٹے یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر کئی بستیاں لوٹ چکے ہیں۔“ یہ کہہ کر میر جعفر، معظم علی کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”معظم علی بنگال کی فوج کا بہترین سپاہی ہے اور اس کی جان بہت قیمتی ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت کا خیال رکھو!“

معظم علی نے کہا: ”آپ میری عزت کریں۔“



دن بھر سفر کرنے کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھیوں نے رات کے وقت ایک گاؤں کے زمیندار کے ہاں قیام کیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایک ندی کے قریب تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے رُکے۔ ندی کے دونوں کناروں پر گھنے درخت تھے۔ کچھ دیر سنانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ درختوں کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے کھول رہے تھے کہ اچانک چاروں طرف درختوں کی آڑ سے قریب پچاس مسلح مرہٹے نمودار ہوئے۔ معظم علی کے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں پر سوار ہونے یا بندھنے کا موقع نہ تھا۔ پچاس آدمی بندھتے ہی سبھی کیے ان کے گرد گھیر ڈھل رہے تھے۔

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا: ”اب مقابلے سے کوئی فائدہ نہیں تمہارے لیے یہی بہتر

ہے کہ تم ہتھیار پھینک دو!“

معظم علی چند ثانیے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے اپنی بندوق اور توار پھینک دی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو اپنے لباس سے اس جتنے کا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے معظم علی سے مخاطب ہو کر سوال کیا: ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

معظم علی نے جواب میں کہا: ”تمہیں ہم سے سوالات پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

مرہٹہ سردار بولا: ”ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“

مرہٹہ سردار نے جواب دیا: ”قیدیوں کو ایسے سوالات کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ میں تمہاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر کسی نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گولی باردی جائے گی۔“

مرہٹہ سردار کے اشارے سے چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے ہاتھ رتوں سے جکڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ایک ہفتہ جنگوں اور پہاڑوں میں سفر کرنے کے بعد انہیں سرحد کے پار ایک گاؤں کے قریب مرہٹہ فوج کا پڑاؤ دکھائی دیا۔ معظم علی اور اس کے ساتھی مرہٹہ سپاہیوں کی بندوقوں کے پہرے میں پڑاؤ عبور کرنے کے بعد گاؤں میں پہنچے اور پھر ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک قلعہ مناعوی کے اندر داخل ہوئے۔ مرہٹہ فوج کے چند سپاہی انہیں دیکھتے ہی جمع ہو گئے۔

معظم علی کو گرفتار کرنے والے دستے کے سردار نے ان کے اسر کو مٹی طرب کرتے ہوئے کہا۔

”سپہ سالار کا حکم ہے کہ ان قیدیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انہیں کوئی تکلیف



زدی جائے۔ لیکن اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے کسی وقت کے بغیر پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ سپہ سالار کچھ عرصہ یہاں نہیں آسکیں گے۔ پھر اس نے معظم علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ بنگال کی فوج کے ایک بڑے افسر ہیں۔ ادھر سپہ سالار کی ہدایت ہے کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔“

افسر نے اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”انہیں لے جاؤ اور کوٹھڑیوں کے اندر بند کر دو۔“ فی الحال ایک کوٹھڑی میں دو قیدی بند کیے جائیں۔“

معظم علی نے آگے بڑھ کر افسر سے سوال کیا: ”میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ ہم کس کی قید میں ہیں؟“

اس نے بے رنجی سے جواب دیا: ”ایک قیدی کو ایسے سوالات پوچھنے کا حق نہیں۔“ پھر وہ سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: ”انہیں اکبر خاں کے ساتھ بڑی کوٹھڑی میں رکھو۔“ پہرہ دار، قیدیوں کو جونی کے ایک طرف لے گئے۔ معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کو چار کوٹھڑیوں میں بند کر دیا اور اس کے بعد انہوں نے ایک کشتہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور معظم علی کو اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔

معظم علی کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا اور پہرہ داروں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر کوٹھڑی کے درمیان بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ کوڑا کے دھاڑے سے سپہ سالار کے سوج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ فرش پر کھجور کی چٹائیاں بھی ہوتی تھیں۔ معظم علی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاً اسے کوٹھڑی کے ایک تارک کوٹھڑی میں ایک اور قیدی دکھائی دیا جو بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: ”بھائی! معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے کچھ عرصہ کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں!“

قیدی جلدی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور معظم علی کے قریب بیٹھنے پر آمادہ ہو گیا۔

اس عیبی کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی، لیکن کوئی بیس دن ہوئے میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، جب سے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔“

معظم علی حیرانی کے عالم میں قیدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بارہ چودہ سال کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ و سپید چہرے کے تھکے نقوش میں غایت درجے کی جاؤہیت تھی۔

”تمہیں کس جرم میں قید کیا گیا ہے؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن لڑکے نے قدرے برہم ہو کر جواب دیا۔“

معظم علی نے کہا: ”تمہاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور یہاں کیسے پہنچے ہو؟“

”لڑکے نے اس سوال کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت شروع کر دی:

”میرا گائوں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے آبا جیاں تھے اور وہ اپنے علاقے کے سردار تھے۔ انہیں گھوڑوں کی تجارت کا شوق تھا۔ وہ راجپوتانہ سے گھوڑے خرید کر کبھی کبھار کبھی حیدرآباد میں فروخت کیا کرتے تھے۔ میرا بڑا بھائی عام طور پر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اس سال میں نے صدقہ کی اور وہ اس کی بجائے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ساتھ چالیس مسلح فوج تھے اور ہم راجپوتانہ سے ڈیرہ سوگھڑے خرید کر کبھڑ کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں اودھ کی سرحد سے تھوڑی دور مرہٹوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ آلبان لدلہ کے ساتھ چندہ اور آرمی ملٹری میں شہید ہو گئے۔ سات آدمی مرہٹوں نے گرفتار کر لیے اور باقی بھاگ گئے۔ مرہٹوں کے سردار نے باقی آدمیوں کو تاشی لے کر چھوڑ دیا، لیکن مجھے اپنے پاس رکھا اور چند دن بعد میرے صیب کے پاس بھیج دیا۔

میرے صیب نے مجھے بیان سنا دیا۔ وہ کبھی کبھی چند دن کے لیے یہاں آتا ہے اور ہمیشہ مجھ سے یہ پوچھتا ہے: ”تمہیں میرے سپاہیوں نے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟ اگر میں کسی کی شکایت کرتا ہوں تو اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ لیکن جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے میرے گھر سے

دیا جائے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جب میں روہیلکھنڈ پر حملہ کروں گا۔ تو تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارے باپ نے اپنے گھر میں ہتھیار و دولت جمع کر رکھی ہے اور جب تم مجھے اپنے گھر کا خزانہ تلاش کرنے میں مدد دو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جب میں اس سے یہ کہتا ہوں کہ ہمارے گھر میں کوئی خزانہ نہیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں خزانے کا علم نہیں تو ہم تمہارے بھائی سے پوچھ لیں گے۔ میرے صیب کو یہ یقین تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے اس حیلے کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ ایک شام میں یہاں سے بھاگ گیا اور ساری رات جنگوں اور پہاڑیوں میں گھومتا رہا۔ لیکن صبح کے وقت چند سواری مجھے دوبارہ گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔ خوش قسمتی سے میرے صیب یہاں نہیں تھا اور اس کے سپاہیوں نے مجھے اس کوٹھری میں بند کرنے کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی۔ جب میرے صیب آیا تو اس نے مجھے دو دن بھوکا رکھنے کی سزا دی۔ اب پھر میرے صیب صبح شام تھوڑی دیر کے لیے اس کوٹھری سے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن ان کا پہرہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اب میرے لیے دوبارہ بھاگ نکلنا ممکن نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ بھی ان کی قید میں ہیں۔ بتائیے آپ یہاں کیسے پہنچے؟

معلم علی نے جواب دیا: میں کلک سے اڑیہ کے ایک سرحدی قلعے کی طرف آ رہا تھا۔ راستے میں مرہٹوں نے اچانک حملہ کیا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ تم سے باتیں کرنے سے پہلے مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں میرے صیب کی قید میں ہوں۔



چھ ماہ بعد ایک صبح چار مسلح سپاہیوں نے معلم علی کوٹھری سے نکالا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ معلم علی کوئی سوال کیے بغیر ان کے ساتھ چل دیا۔ سپاہی ایک کمرے کے دروازے پر کے اور معلم علی ان کے اشارے پر کمرے کے اندر داخل ہوا۔ یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت سازد سامان سے آراستہ تھا۔ اور دو آدمی قالین پر بیٹھے

شطرنج کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے لباس سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک بڑا پتلا نوجوان تھا اور دوسرا جس کی عمر چالیس سال سے اوپر معلوم ہوتی تھی وہ ہرے جسم کا ایک بارعب آدمی تھا۔

تمہارا نام معلم علی ہے؟ قوی بیگل آدمی نے سوال کیا۔

ہاں! معلم علی نے جواب دیا۔

میں نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی قیدی کو بلاوجہ تکلیف نہ دی جائے۔ تمہیں میرے آدمیوں سے کوئی شکایت تو نہیں؟

معلم علی نے جواب دیا: ایک قیدی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے؟

”ہم کوشش کریں گے کہ تم اپنی قید کو بہت زیادہ محسوس نہ کرو۔ میں بہادری کی عزت کرتا ہوں اور تم مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت میں اپنی جرأت و ہمت کا ثبوت دے چکے ہو۔“

معلم علی نے کہا: آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔

تمہارے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ اب یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ سرحد کا نائب فوجدار اس کے آٹھ ساتھی کہیں پویش ہو گئے ہیں اور میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہ تھا، کہ یہ نائب فوجدار کون ہے۔

میں اپنی ذات کے لیے آپ سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن اگر آپ میرے صیب ہیں تو میں بیگل سے آپ کی دشمنی کی وجوہات پوچھنا چاہتا ہوں۔

میرے صیب نے جواب دیا: میں کسی کا دوست ہوں نہ دشمن۔ میری دلچسپی صرف بیگل کے حکمران اور ملکہ کی دولت سے ہے۔

لیکن آپ مرہٹوں کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں؟

”مرہٹے مجھے دولت حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کسی دولت مند



آدی کے بیٹے نہیں ہو۔ لیکن اگر تم مجھے کسی دولت مند آدمی کے گھر کا پتہ بتاؤ تو مجھے تمہارا تعاون حاصل کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

معلم علی نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا: ”میں تمہیں ایک ہی گھر کا راستہ بتا سکتا ہوں اور وہ مرشد آباد کا قید خانہ ہے۔“

میر حبیب نے بے پردگی سے جواب دیا: ”قید خانے میں وہ جلتے ہیں جن کی کسی کو بھی ضرورت نہ ہو اور میں بدترین حالات میں بھی بنگال کے حکمران کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اسے میری ضرورت ہے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو، مجھے میں حیران ہوں کہ تم نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تم بڑے بڑے امراء کی تجدیدوں پر پیرہ دے کر بنگال کی کوئی خدمت کر رہے ہو؟“

”اگر تمہیں اس بات کا افسوس ہے کہ تمہارے سپاہی صین بیگ کے گھر سے نامراد واپس آئے تھے تو میں تمہاری غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں۔ مرزا حسین بیگ کے گھر میں روپیہ نہیں بکھرتا تھی جس کی حفاظت ہر شریف آدمی کا فرض تھا۔“

میر حبیب نے جواب دیا: ”میں نے اپنے جیسے جیسے میں کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو موت کے معنی سمجھتا ہو۔ وہ صرف دولت اور حکومت کے معنی سمجھتے ہیں۔“

معلم علی نے کہا: ”میں جس بنگال کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں وہ صرف امیروں اور حکمرانوں کا بنگال نہیں ہے میرا وہ بنگال ہے جسے لاکھوں مسلمان اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ یہ میرا گھر ہے اور یہ اسے چوروں، رابرزوں اور انسانیت کے دشمنوں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”نوجوان! میں تمہارے خیالات کی داد دیتا ہوں۔ لیکن جس بنگال کو میں جانتا ہوں، اس کے محافظ میرے نزدیک باہر کے رہزموں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دن بہت جلد آ رہا ہے جب تم بنگال کے متعلق سوچنے کی بجائے اپنے متعلق سوچنا زیادہ بہتر سمجھو گے صرف

علی مدنی خاں کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تم بنگال کے متعلق سوچنا بھی تمہاری سمجھ گچھ۔ اتنی دیر شاید تم میری قید میں رہو۔ لیکن اگر اس سے پہلے ہی تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آجائے تو میں بڑی خوشی کے ساتھ تمہارا تعاون قبول کروں گا۔ پھر تم بنگال کے متعلق نہیں بلکہ اپنے متعلق سوچیں گے۔ بالکل مرشد آباد کے امراء کی طرح، جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو علی دردی خاں کا واحد جانشین سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کے غروں کے جواب میں میں بھی یہ نعرہ لگانے کا حق ہے کہ بنگال ہمارا ہے۔“

معلم علی نے کہا: ”اگر آپ کی رفعت سے مجھے دلی کاشت ملنے کی امید ہو تو بھی میں ایک قیدی کی حیثیت میں گناہی کی موت کو ترجیح دے دوں گا۔“

میر حبیب نے کہا: ”انسان کے خیالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں چند ماہ یا چند برس انتظار کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تمہیں حویلی کے اندر گھومنے پھرنے کی پوری آزادی ہوگی، لیکن اگر تم نے جھگڑنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

معلم علی کمرے سے باہر نکلا اور مسلح سپاہیوں کے ساتھ دروازے کے باہر کھڑے تھے چل دیا۔



علی دردی خاں کی افواج، میدان پور کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ میر حبیب علی دردی خاں کے خیمے میں داخل ہوا۔ اور تین دفعہ قریشی سلام کرنے کے بعد ادب سے کھڑا ہو گیا۔ علی دردی خاں کی سز کے پیچھے دماغی فطرت نئی تلواریں لیے کھڑے تھے۔ میر حبیب چند ثانیے خون و اضطراب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر علی دردی خاں نے کہا: ”ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عطار اللہ خاں یہاں حاضر ہونے سے کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟“

”عالیماہ! مجھے معلوم نہیں:

علی دردی خاں نے کہا: ہمارے خلاف کوئی سازش تمہارے علم کے بغیر نہیں ہوتی۔  
 ”عالیجاہ! اگر مجھے اس کی سازش کا علم ہوتا تو میں اس کا سر لے کر حضور کی خدمت  
 میں پیش ہوتا۔“

”اس کے سر کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس  
 کے عزائم کیا ہیں اور اسے ہماری فہم مدد کی جزا کیسے ہوئی اور معظم علی کا آج تک کیوں پتہ  
 نہیں چلا؟“

”عالیجاہ! کنگ کا صوبیدار آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہے۔ جہاں تک میری  
 معلومات کا تعلق ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسر عطار اللہ خاں  
 کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ اگر اس کی نیت بری ہو تو سبھی وہ موجودہ حالات میں حضور کے خلاف کوئی  
 سازش نہیں کر سکتا۔ وہ صرف اپنی جان کے خوف سے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے سے  
 پس و پیش کرتا ہے۔ میں نے حضور کا حکم ملنے ہی معظم علی کے متعلق تحقیقات کی تھی۔ بد قسمتی  
 سے جس دن وہ کنگ سے روانہ ہوا تھا۔ میں وہیں تھا اور میں نے اسے یہ کہا تھا، کہ تم آٹھ آدمیوں  
 کے ساتھ سفر کرنے کی بجائے فوج کا انتظار کرو اور میرے اس مشورے کی وجہ یہ تھی کہ مجھے  
 سرحد کے آس پاس مرہٹوں کی سرگرمیوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن معظم علی ایسے مشورے سننے  
 کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ مارا گیا ہے یا قید ہو گیا ہے۔ بہر حال وہ کنگ  
 سے میرے سامنے روانہ ہوا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عطار اللہ خاں نے اس کے خلاف کوئی  
 سازش کی ہو لیکن یہ ثابت کرنا آسان نہیں۔“

علی دردی خاں نے قدرے نرم ہو کر سوال کیا: ”عطار اللہ خاں کے متعلق تمہارا کیا  
 مشورہ ہے؟“

”عالیجاہ! یہ اخیال ہے وہ ڈر کے مارے حضور کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ میری یہ  
 درخواست ہے کہ حضور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے اگر

اس کی نیت خراب ہے تو ممکن ہے میں اسے یہ سمجھا سکوں کہ تمہاری سازش طشت از بزم  
 ہو چکی ہے اور تمہارے پچاؤ کی اب یہی ایک صورت ہے کہ تم کسی وقت کے بغیر حضور کی خدمت  
 کے لیے حاضر ہو جاؤ۔“

علی دردی خاں نے کہا: ”اے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں! اگر تم اسے راہ راست  
 پر لا سکتے ہو تو اسے کہو کہ وہ استغفادے کر سیدھا مرشد آباد چلا جائے۔“  
 ”عالیجاہ! اگر میں اسے یہ یقین دلا سکوں کہ آپ نے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا ہے تو  
 مجھے یقین ہے کہ وہ مرشد آباد جانا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔“

”تصیں غلاموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال اگر وہ راست پر آجائے تو ہم  
 اس کے لیے معمولی سزا کافی سمجھیں گے۔“



رات کے وقت عطار اللہ خاں اپنی قیام گاہ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے نوکر نے  
 اسے جگایا اور کہا: ”میر حजर تشریف لائے ہیں اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتے  
 ہیں۔ میں نے انہیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ان کے ساتھ فوج کے دو  
 افسر بھی ہیں۔“

عطار اللہ خاں پریشانی کی حالت میں لباس تبدیل کیے بغیر نیچے اترا اور ملاقات کے  
 کمرے میں داخل ہوا۔ میر حजर نے اٹھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اپنے ساتھیوں کی  
 طرف متوجہ ہو کر کہا:

”تم جا کر سپاہیوں کے آرام کا بندوبست کرو، میں ابھی آتا ہوں۔“  
 فوجی افسر اٹھ کر باہر نکل گئے اور میر حजर نے عطار اللہ خاں سے کہا: ”مجھے افسوس ہے کہ  
 میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کو بروقت  
 خبردار کیا جائے۔“



وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عطاء اللہ خاں کچھ دیر انتہائی پریشانی اور اضطراب کی حالت میں جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے ہیں۔ مجھے میڈیٹاپور میں علی وردی خاں کی آمد کی اطلاع ملے ہی یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے کسی ساتھی نے انھیں ہمارے ارادوں سے خبردار کر دیا ہے۔“ میر جعفر نے کہا: ”مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ لیکن آپ سے ایک غلطی ضرور ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آپ علی وردی خاں کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ میرا آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میڈیٹاپور میں علی وردی خاں کی غیر متوقع آمد کے بعد ہماری سازش کی کامیابی کے امکانات بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اس کے شکر کا مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہو گا۔ اگر وہ کلک پہنچ گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی فوج کے بیشتر سپاہی اپنی شکست کو یقینی سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ کہ استعفا دے کر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے علی وردی خاں کو آپ کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر آپ مستعفی ہو کر مرشد آباد چلے جائیں تو آپ پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔“

عطاء اللہ خاں کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میر جعفر کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا:

”علی وردی خاں نے آپ سے بھی استعفا کا مطالبہ کیا ہے؟“

”نہیں اور اگر آپ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو شاید یہ صورت پیدا نہ ہوتی۔ عطاء اللہ خاں نے جواب دیا: ”میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد کی پناہ لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میر صاحب آپ یوں ہی گھر آگئے ہیں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیتا ہوں۔ میر صاحب مرحوم سے زیادہ دور نہیں۔ ہمیں اس کی پناہ لے کر علی وردی خاں کے ساتھ جنگ کے لیے تیاری کا وقت مل

جائے گا۔“

میر جعفر نے جواب دیا: ”میں یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میر صاحب ایک ڈاکو ہے۔ اور اس کی دوستی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بنگال کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانے کی امید پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں جب کہ اسے آپ کی کامیابی کا یقین ہو۔ لیکن جب آپ ایک شکست خوردہ آدمی کی حیثیت میں اس کے پاس جائیں گے تو وہ آپ کو چند لمحوں کے عوض میں علی وردی خاں کے ہاتھ فروخت کرنے سے بھی دلچ نہیں کرے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ اگر مستعفی نہ ہوئے تو بھی علی وردی خاں آپ کو سبکدوش کر دے گا۔ اس لیے میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ آپ ابھی انھیں یکمیں کر مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کا اعتماد کھو چکا ہوں اور میرے مخالفین آپ کو بھڑکنے کے لیے میرے متعلق اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں مستعفی ہو جاؤں اور آپ سے یہ درخواست کروں کہ مجھے مرشد آباد میں اپنی زندگی کے باقی ایام گزارنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اگر آپ کو کسی دقت میری نیک نیتی کا یقین آجائے تو مجھے ہر وقت اپنی خدمت کے لیے تیار پائیں گے۔“

عطاء اللہ خاں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: ”میر صاحب آپ کو یقین ہے کہ استعفا دینے کے بعد مرشد آباد جانا میرے لیے خودکشی کے مترادف نہیں ہو گا؟“

”نہیں! بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کو مرشد آباد پہنچنے ہی علی وردی خاں کا یہ بیٹا ملے گا کہ ہمارے تمام شکوک دور ہو چکے ہیں اور تمہیں فلاں عہدہ پر مامور کیا جاتا ہے۔“

عطاء اللہ خاں نے کہا: ”مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اتنی جلدی بازی مار چکا ہوں۔“ میر جعفر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”میرے دوست آپ نے بازی نہیں ہاری۔“

علی مددی خاں اپنی عمر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہے۔ مستقبل ہمارا ہے اور ہم چند مہینے یا چند برس اور انتظار کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی شکست کا اعتراف کرنے یا ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دینے نہیں کیا بلکہ یہ مشورہ دینے کے لیے آیا ہوں کہ آپ ہتھیار اٹھانے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کریں:

عطاء اللہ خاں نے کہا: میرے صاحب! جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے تو آپ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ مجھے ایسی صورت حالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اب اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو میں انتظار دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اسٹیفے کا جواب آنے تک میرا یہاں رہنا ضروری ہوگا۔ پھر اگر علی مددی خاں نے مجھے مرشد آباد جانے سے منع کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آپ کو جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ استغاثہ کے حوالے کریں۔ اندکی تاخیر کے بغیر مرشد آباد روانہ ہو جائیں۔ علی مددی خاں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا۔ عطاء اللہ خاں نے اللہ کے دروازے کے قریب جا کر ذکر کو آواز دی اور کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ اب پھر میرے جگر کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرے صاحب! اسٹیفے کا مضمون کھننے کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

بہت اچھا! میں بولتا جاؤں گا اور آپ کہتے جائیں:

دوسرے روز علی الصباح عطاء اللہ خاں مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا اور اس کی روانگی کے چند دن بعد مر جعفر میڈیا پور پہنچ کر علی مددی خاں سے یہ کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! خدا کا نیکو ہے کہ اس نے میری باتوں میں اگر استغاثہ سے دیا، ورنہ اس کے عزائم بہت خطرناک تھے، مرشد آباد میں وہ حضور کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے جاسوس بر وقت اس کی غوثی کے لیے موجود ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی نادان دوست نے بہکایا تھا۔ اب اگر حضور کی ہمارت ہو تو میں اسے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضور والا شان نے

تمہارا استعفا منظور کر لیا ہے۔ سابقہ غلطیوں کے بارے میں تم سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ لیکن آئندہ کے لیے تمہیں بے حد محتاط رہنا چاہیے!

اور علی مددی خاں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا: ہاں، اور اسے یہ بھی کھدو کہ اس کی سابقہ فوجی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کے گزارے کے لیے ایک معقول وظیفہ دیا جائے؟



## ساتواں باب

میر حبیب کی قید میں معظم علی کے لیے زندگی صبح و شام کے ایک بے کیف تسلسل کا نام تھی۔ اسے بنگال کے حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ قید کی تنہائی میں اکبر خاں اس کے لیے ایک بہت بڑا سہارا بن چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے اپنے خاندان، عزیزوں اور دوستوں کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ذہنی کرب کے باعث معظم علی کسی کئی گھنٹے خاموش رہتا اور اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ "بھائی جان! آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہماری مدد کرے گا اور ہم بہت جلد ان خالوں کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ آپ کہتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ میں ہر وقت آپ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ہوں۔ آپ کہتے تھے خدا اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے۔ لیکن آج آپ مغموم ہیں۔"

جب مسکرانے کی کوشش کے باوجود اکبر خاں کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر پڑی ہو جاتیں تو معظم علی خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر اسے تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتا۔ "اکبر میں اپنے متعلق نہیں۔ بلکہ اپنی قوم اور اپنے وطن کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وطن کیا ہو رہا ہے؟"

پھر وہ آپس میں بار بار کی ہوئی باتیں دہراتے اور حال کی مایوسیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتے۔ اکبر خاں اپنے وطن کے حسین

اور دلکش مناظر بیان کرتا اور معظم علی اسے مرشد آباد کی ان گلیوں اور مکانوں کے متعلق بتاتا جہاں وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ پھر وہ قید سے آزاد ہونے کے بعد ایک دوسرے کا وطن دیکھنے کا وعدہ کرتے۔

اکبر خاں اپنی عمر کے عام بچوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ اور ذہین تھا۔ وہ معظم علی کو اس حویلی کے اندر اور باہر مہنوں کے کیچپ کے تمام حالات بتا چکا تھا۔ فرار کی کوشش سے پہلے جب اسے ادھر ادھر گھومنے کی آزادی تھی وہ پڑاؤ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ معظم کو بتا چکا تھا کہ مہنٹے گاؤں کے اہل باشندوں کو نکالنے کے بعد ان کے مکانات پر قبضہ کر چکے ہیں بیشتر مکانات ان کے گھوڑوں کے لیے اصطبلوں کا کام دیتے ہیں اور بعض مکانات میں انھوں نے گولہ بارود اور رسد کے ذخیرے جمع کر رکھے ہیں، پھر پڑاؤ کی ٹولیاں دن رات گاؤں کی گلیوں میں گشت کرتی ہیں۔ گاؤں کے باہر چاروں طرف مہنٹے سپاہیوں کے خیمے ہیں۔ اس حویلی کی چار دیواری کے اندر بھی بعض کوٹھڑیوں کے تہہ خانوں میں رسد اور بارود کے ذخیرے جمع ہیں۔

اکبر خاں سے متعدد سوالات پوچھنے کے بعد معظم علی کو اپنی کوٹھڑی سے باہر ہر دیوار، برگلی اور بر مکان کا نقشہ حفظ ہو چکا تھا۔ صبح شام انھیں تنواری دیر ہوا خوری کے لیے قید خانے سے باہر نکالا جاتا۔ معظم علی حویلی کے اندر دوسرے قیدیوں کے علاوہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے ملتا لیکن مسلح پیردار ہر وقت اس کے سر پر وجود ہوتے اور اسے کسی سے بات کرنے کا موقع نہ دیتے۔

ایک دن اکبر خاں فرار ہونے کے متعلق اسے اپنی نئی تجویز بتا رہا تھا معظم علی دیر تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "اکبر خاں تمہیں معلوم ہے کہ بھاگنے کی ناکام کوشش ہمارے لیے کس قدر خطرناک ثابت ہوگی۔ پھر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر وہ اس کوٹھڑی سے باہر رہ کر گرد و پیش کے حالات معلوم کر سکو تو شاید

ہم بھاگنے کے متعلق کوئی بہتر تجویز سوچ سکیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ اگر تم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تو ممکن ہے ہم بہت جلد رہا ہو جائیں۔

اگلے دن پیریار کھانے کو آیا تو معظم علی نے اس سے کہا: "میں میرے حبیب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پیریار نے جواب دیا: "وہ یہاں نہیں ہیں جب وہ آئیں گے تو آپ کی درخواست پسپا دی جائے گی۔"

معظم علی انتہائی بے چینی سے میرے حبیب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ صبح اٹھتا اور پیریار سے پوچھتا مگر اسے نفی میں جواب ملتا۔

کوئی دس ماہ انتظار کے بعد پیرے داروں کے ایک افسر نے اس کے پاس آکر اطلاع دی کہ میرے حبیب تشریف لائے ہیں اور آپ کی درخواست ان تک پسپا دی گئی ہے لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

معظم علی نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں چند دن اور گزارے۔ ایک دن اچانک اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور میرے حبیب فوج کے دو افسروں اور چار مسلح سپاہیوں کے ہمراہ کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ معظم علی اور اکبر خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میرے حبیب نے سوال کیا: "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آپ ایک بہادر آدمی ہیں۔ لیکن بہادری اور بے رحمی میں بہت فرق ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس معصوم بچے نے کیا گناہ کیا ہے۔ اور آپ اسے کب تک قید میں رکھنا چاہتے ہیں؟"

میرے حبیب نے جواب دیا: "ایک قیدی کو دوسرے قیدی کی سفارش کا حق نہیں۔"

تاجم ذاتی طور پر میری یہ خواہش دہشت گردی کے اندر بند کیا جائے۔ لیکن اس نے بھاگنے کی خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی شکل دیکھ کر رحم آ گیا تھا۔

معظم علی نے اکبر خاں کی طرف دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر میرے حبیب کا دامن پکڑتے ہوئے کہا: "خدا کے لیے میرا قصود معاف کر دیجیے۔ اب اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولی مار دیجیے۔"

میرے حبیب نے کہا: "میرا خیال تھا کہ تم یہاں خوش ہو۔"

"نہیں! نہیں! اکبر خاں نے جواب دیا: "میں کبھی ہوا میں رہنا چاہتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وطن کس سمت ہے لیکن اگر یہ بھاگ بھی جائے تو آپ اسے کون سے خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں؟"

میرے حبیب نے کہا: "دیکھو اکبر! میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں باقی تمام عمر اس بہ خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں دوپہر کے وقت بھی روشنی نہیں پہنچتی۔"

پھر وہ پیریاروں کی طرف متوجہ ہوا: "اسے جاؤ! لیکن اس کا اچھی طرح خیال رکھو! اکبر خاں ایک پیریار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے حبیب دروازے کے قریب پہنچ کر اچانک مڑا اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر بولا: "میرا خیال تھا کہ تم اپنے متعلق کچھ کہتے چلتے ہو؟"

"اپنے متعلق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کی قید میں ہوں۔ جس سے دھم یا انصاف کی درخواست کرنا بے سود ہے اور میں اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں جب انصاف کی توار میرے ہاتھ میں ہوگی۔"

میرے حبیب غصے میں آنے کی بجائے مسکرایا اور اس نے سوال کیا: "جب انصاف کی توار تمہارے ہاتھ میں ہوگی تو تم کیا کر دے گے؟"

"میں آپ کو اس سے بہتر کوٹھڑی دل گا اور آپ کے ساتھ کوئی ایسا قیدی نہیں رکھوں گا۔ جس کی مظلومیت اور بے بسی کے احساس سے آپ اپنی تکالیف بھول جائیں۔"



”تم بیوقوف ہو۔ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔“ میر حبیب یہ کہہ کر نکل گیا۔



قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے حویلی کے صحن میں تین چھولہ لاریاں نصب تھیں۔ درمیانی چھولہ لاری ذرا بڑی تھی جس میں قیدیوں کے محافظوں کا جھنڈا رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو چھولہ لاریاں میں آٹھ سپاہی رہتے تھے۔ گرمی کے موسم میں قیدیوں کے محافظ دن کے وقت ان چھولہ لاریوں میں پناہ لیتے تھے۔ لیکن رات کے وقت وہ قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے سامنے کھلی فضا میں آرام کرتے تھے۔ دو دو پہیہ داروں کی چار ٹولیاں رات کے وقت باری باری قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے گشت کرتیں اور شام سے صبح تک ہر تین گھنٹے کے بعد پھرو بدلتا تھا۔ اس چوکی کے دوسرے محافظ جن کی تعداد عام طور پر پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہوتی تھی بڑے دروازے کی طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں اور بانس کے چھپرے میں رہتے تھے۔

میر حبیب نے اکبر خاں کو معظم علی کی کوٹھڑی سے نکال کر قیدیوں کے محافظ سپاہیوں کے جھنڈے کے سپرد کر دیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ اکبر خاں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ جھنڈا ایک مرہٹہ تھا اور اس کا نام مرلی دت تھا۔ مرلی دت بے حد موٹا تھا۔ وہ سرے گنجا تھا اور اس کے سیاہ چہرے پر چچک کے داغ تھے۔ دو سال قبل وہ میر حبیب کی فوج کے اچھے سپاہیوں میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن ایک لڑائی میں زخمی ہونے کے باعث اس کی بائیں ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اپنے ماتحت سپاہیوں کے ساتھ وہ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لیکن اکبر خاں کے ساتھ اس کا برتاؤ نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے اکبر خاں کو قید خانے کی کوٹھڑی سے نکلانے کے بعد اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا: ”میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ لیکن تم نے مجھنے کی کوشش کی۔ میر صاحب نے تمہیں ایک موقع اور دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب بھی تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ مجھانے کی کوشش کی تو تمہارا

انجام بہت برا ہوگا۔“

اکبر خاں نے انتہائی مصحوبیت کے انداز میں جواب دیا۔ ”جی میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم کوئی شرارت نہ کرو!“

چند دنوں کے اندر اکبر خاں، مرلی دت کے لیے ایک کارآمد نوکر بن چکا تھا۔ وہ صبح سویرے آٹھ بجھولہ لاری میں جھاڑو دیتا۔ اس کا بستر درست کرتا اور کبھی کبھی اس کے کپڑے بھی دھو لاتا۔ سپاہی اس پر اس لیے خوش تھے کہ پہلے اس قسم کے تمام کام انہیں کرنے پڑتے تھے۔

مرلی دت کو بانسری بجانے اور اس سے زیادہ سنسنے والوں سے داد حاصل کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اس کے چند سپاہیوں کے علاوہ جلسے ایک مجبوری سمجھ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے، قلعے میں کسی اور کو اس کے اس فن سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دوسرے سپاہی اور افسر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بانسری بجانے کے علاوہ اسے کانے کا بھی شوق تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس کی آواز اس کی صورت سے بھی زیادہ کریہ تھی۔

اکبر خاں کو اس کی کمزوری کا علم تھا اور وہ جی کھول کر اسے داد دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا ”چچا مرلی دت! آپ! آپ! آپ تو کمال کرتے ہیں۔ میں نے کسی اور کو اتنی اچھی بانسری بجانے نہیں دیکھا۔“

اور وہ جواب دیتا: ”اے سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور تم ان سب سے

زیادہ سمجھدار ہو۔“

چچا مرلی دت! آپ کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ کاش میں بھی اس طرح کا سگتا!

اور مرلی دت خوش ہو کر کہتا: ”کانے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے بیٹا!

آہستہ آہستہ اکبر خاں پر مرلی دت کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اسے حویلی کے اندر گھومنے کی آزادی

تھی۔ جب قیدیوں کو تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑیوں سے باہر نکالا جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان کے پاس چلا جاتا۔ پہریلوں کی موجودگی میں اسے عام طور پر معظم علی سے بات کر کے موقوفہ نہ ملتا۔ لیکن جب کبھی سپاہیوں کی توجہ دوسری طرف ہوتی تو وہ آہستہ سے کوئی بات کہہ کر نکل جاتا۔

جب سپاہی قیدیوں کے لیے کھانا لے کر آتے تو وہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے کبھی روٹیوں کی ٹوکری اور کبھی پانی کا ٹھکا کر لیتا۔ آہستہ آہستہ پہریلوں سے اس قسم کے کام لینے کے عادی ہوتے گئے۔ پانچ چھ ہفتوں کے بعد یہ حالت تھی کہ جب قیدیوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آتا تو سپاہی اسے کبھی گنوں سے پانی اور کبھی نونوٹانے سے کھانا لانے کے لیے کہتے۔

کوٹھڑیوں کے تالوں کی چابیاں مرلی دت ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ رات کے وقت قیدیوں کو کھانا دینے کے بعد وہ چابیوں کا گچھا چھو لہاری کے اندر ایک مکرئی کے صندوق میں بندوق میں بند کر دیتا تھا۔ اور صندوق کے تالے کی چابی جو ایک دھلاگے میں بندھی ہوتی تھی۔ اپنے گلے میں ڈال لیتا تھا۔ پہریلوں کو باہر نکلنے کے لیے مرلی دت سے چابیاں لینے آتے تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت ذرا خراب تھی۔ اس نے لٹے لٹے اکبر خاں کو صندوق کی چابی دیتے ہوئے کہا: "جاؤ تم نکال دو!"

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد اکبر خاں مستقل طور پر یکام اپنے ذمے لے چکا تھا۔ ایک رات ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مرلی دت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بانسری بجاتا رہا اور اس کے بعد اپنی موٹی اور بھٹی آواز میں اکبر خاں کو چند گیت سنانے کے بعد لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد گری نیند میں اس کے خزانے جو حویلی کے تقریباً سرسپاہی اور انفسر کے لیے موضوع بحث بن چکے تھے۔ اکبر خاں کو پریشان کر رہے تھے۔ پچھلے پہر جب بارش ختم ہوئی تو اکبر خاں نے اپنی کھاٹ چھو لہاری سے باہر نکال لی۔

دو پہریلوں گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: "کیوں اکبر خاں کیا بات ہے؟"

کچھ نہیں! چچا مرلی دت بن بجا رہا ہے اور مجھے نیند نہیں آتی! کچھ نہ کرنے اس کے قریب آکر کہا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ توپ کی آواز بھی اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو مرلی دت کے ساتھ چھو لہاری میں پہننے کی بجائے ترخانے میں رہنا زیادہ پسند کرتا۔ لیکن دیکھو یہ بات کہیں اس سے نہ بکھر دینا! دوسرے سپاہی نے کہا: "یعنی اکبر خاں! پرسج بتاؤ تمہیں واقعی ان کا گانا پسند ہے؟" آدھی رات تک وہ بانسری بجاتے رہے اور پھر جب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر سونے کے لیے وقت مل جائے گا تو تم گھنٹے کے لیے اصرار کرنے لگے:

"ان کا گانا مجھے بہت پسند ہے۔" اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹے ہوئے جواب دیا۔ صبح کے وقت پہریلوں نے اکبر خاں کو جگایا اور کہا: "جاؤ چابیاں لے آؤ!" اکبر خاں آنکھیں ملتا ہوا چھو لہاری میں داخل ہوا تو مرلی دت بدستور خزانے لے رہا تھا۔ اس نے مرلی دت کو جگننے کی بجائے آگے بڑھ کر اطمینان سے دھلاگے کی گرہ کھولی اور اس کے گلے سے چابی اتار لی۔ پھر اس نے صندوق کا تالا کھولا اور قید خانے کی چابیوں کا گچھا لے کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کھاٹ چھو لہاری کے اندر لے آیا۔ اور اس پر لیٹتے ہی گری نیند سو گیا۔

اچانک اسے مرلی دت کی آواز سنائی دی "اکبر خاں! اکبر خاں!! بہت دیر ہو گئی۔ جاؤ پہریلوں کو چابیاں دے آؤ۔ مجھے رات نیند نہیں آتی!"

اکبر خاں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مرلی دت نے اپنے گلے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بدحواس ہو کر کہا: "ارے میری بی کہاں گئی؟"

اکبر خاں نے اپنے گلے سے چابی اتار کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: "مجھے، میں نے"



پہرے دلوں کو چابیاں نکال دی ہیں۔ آپ گمری نیند سو رہے تھے۔ اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

”تم بہت شریر ہو!“ مرلی دت نے چابی کا دھکا اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہنا لیا۔ مجھے بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے جگایا نہیں؟

”اب مجھے نیند آرہی ہے۔“ اکبر خاں نے کھاٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ اس واقعہ سے چند ہفتے بعد صبح کے وقت قیدیوں کو کونٹوں سے باہر نکالا گیا تو اکبر خاں نے موقع پاکر معظم علی سے کہا: ”میرے حبیب کل کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں یہ سخت نہیں ہوتا۔ بادل آ رہے ہیں اگر آج رات بارش شروع ہو گئی تو آپ تیار رہیں۔“



شام کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، مرلی دت چھو لہاری کے باہر کھاٹ پر بیٹھا اطمینان سے بانسری بجا رہا تھا۔ اکبر خاں پہرے دلوں کے ساتھ قیدیوں کو کھانا تقسیم کرنے کے بعد اس کے پاس آیا اور اس نے چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ”چچا مرلی دت آج بہت گرمی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بعض راگیناں بارش لے آتی ہیں۔ آپ کو کوئی ایسا راگ آتا ہے؟“

مرلی دت نے بے پردائی سے جواب دیا: ”راگ آدمی کے لیے ہوتے ہیں۔ بادلوں کے لیے نہیں۔“ اور پھر بانسری بجنے میں مصروف ہو گیا۔

اکبر خاں نے قہرے سے توقف کے بعد کہا: ”چچا مرلی دت چابیاں اندر رکھ آؤں؟“ مرلی دت نے جواب دینے کی بجائے اپنے گلے سے صندوق کی کنجی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اکبر خاں چابیوں کا گچھا لے کر اندر چلا گیا۔ اس کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ چند لمبے وقف کے بعد اس نے چابیوں کا گچھا صندوق کے پیچھے رکھ دیا۔ پھر اس نے صندوق کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے بعد تالا کھولا اور اس کا ڈھکنا زور سے بند کرنے کے

بعد تالا لگا کر باہر نکل آیا۔

”کیسے بیوقوف ہو!“ مرلی دت نے جھنجھلا کر کہا ”تم میرا صندوق توڑ ڈالو گے۔“ اکبر خاں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”چچا! اندر بہت گرمی ہے۔ دیکھو مجھے پسینہ آ رہا ہے۔“

”آج بارش ضرور آئے گی۔“ اس نے اکبر خاں کے ہاتھ سے چابی لے کر گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں مرلی دت کے سامنے دوسری کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اس پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا:

”بھئی یہاں آؤ! آج چچا مرلی دت کمال کر رہے ہیں۔“ اور سپاہی مرلی دت کی موسیقی سے بے لطف اندوز ہونے کی بجائے اس کے عتاب سے بچنے کے لیے اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

مرلی دت نے کہا: ”راگ سمجھنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ اب ذرا غور سے سنو۔“ اور وہ کوئی ایک گھنٹہ انتہائی بیچارگی کی حالت میں بیٹھ رہے۔ اچانک بارش کی موٹی موٹی بوئیں گرنے لگیں۔ بادل گرجا اور موسلا دھار زمین پر برسنے لگا۔

اکبر خاں نے کہا: ”چچا مرلی دت بارش آگئی اٹھیے، آپ کی کھاٹ اندر کر دوں؟“ اور وہ بدستور بانسری بجاتا ہوا چھو لہاری کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر اکبر خاں اور مرلی دت چھو لہاری کے اندر اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹے رہے مرلی دت بانسری بجنے کی بجائے ایک انتہائی ناقابل برداشت نے میں گارہا تھا۔ وہ گاتے گاتے سو گیا اور پھر اس کے خزانے تاریک رات کی ہولناکی میں اضافہ کرنے لگے۔

اکبر خاں کے دل کی دھڑکنیں دوبارہ تیز ہونے لگیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ بالآخر اٹھا اور کھاٹ سے آکر کھٹوں اور گھٹنوں کے بل فرش پر چلتا ہوا صندوق کے پاس پہنچا۔

صندوق کے پیچھے چابیوں کے گچھے کو ہاتھ گنے سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ بجمد ہو کر رہ گیا۔ لیکن مرلی دت کے خراٹوں کے تسلسل نے اس کے توہمات دور کر دیئے۔ وہ مڑا اور اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چھو لہاری کے دروازے پر کھڑا ہو کر باہر جھلکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد پانی اور کپڑوں کے پادوں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ تیلیوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اکبر خاں دبے پادوں معظم علی کو کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ وہ کوٹھڑی کے تالے میں یکے بعد دیگرے مختلف چابیاں لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سپاہیوں کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ دروازے کے ساتھ جھٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خون دہراس کے باعث اس کی یہ حالت تھی کہ اسے اپنا سانس بھی بارے محسوس ہوتا تھا۔ سبکی کی ایک ہلکی سی چمک ان تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتی تھی جو اس نے مہینوں کے غور و خور کے بعد تیار کیے تھے۔

ایک پہرہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا: "بھئی چلیں اپنی چھو لہاری کے اندر۔ یہ طوفان بہت خطرناک ہے۔"

"شہر! میں ابھی آتا ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"کہا، جلد۔"

"ذرا جمہور صاحب کا حال دیکھ آؤں۔"

ایک پہرہ دار، اکبر خاں سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر رک گیا اور دوسرا مرلی دت کی چھو لہاری کی طرف بڑھا۔

چند منٹ بعد وہ ہنستا ہوا واپس آیا اور بولا: "جو بھئی! جمہور جی کو اس وقت دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم اپنی چھو لہاری کے اندر بیٹھتے ہیں۔ یہ کجنت خود جیسے کی طرح سوتا ہے اور یہ ایسی بارش میں بھی سر چھیلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر ان کو ٹٹوں میں کون سا غرا بنے

جسے کوئی ٹوٹنے آئے گا۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگاتے رہیں گے۔ وہ چلے گئے۔

اکبر خاں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چابی لگ گئی۔ اس نے تالا کھل کر کھنڈی اتاری اور آہستہ سے کواڑ کے پٹ اندر کی طرف دھکیل دیئے۔

"بھائی جان! بھائی! اس نے دبی زبان میں کہا۔

"بکر آہستہ بولو!" معظم علی نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

اکبر خاں نے کہا: "پہرہ چھو لہاری کے اندر چلے گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آؤ ہمارے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اکبر خاں نے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "یہ لیجئے! اگر پہرہ جلدی نہ آگئے تو ہم تمام کو ٹھٹھیاں کھول سکتے ہیں۔"

معظم علی نے باہر نکل کر دروازے کو کھنڈی لگا دی اور کہا: "اس کا تالا کہاں ہے؟"

اکبر خاں نے جواب دیا: "وہ میں نے چھت پر پھینک دیا ہے۔"

معظم علی جلدی سے آگے بڑھ کر دوسری کوٹھڑی کا تالا کھولنے میں لگ گیا۔ چند چابیاں آزمائے

کے بعد اس نے تالا کھول لیا۔ کوٹھڑی کے اندر اس کے دو ساتھی منتظر تھے۔ اس نے چابیوں

کے گچھے کی رسی کھینچ کر توڑ ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو چابیاں تقسیم کرتے ہوئے کہا: "تم ان چابیوں

سے جن کوٹھڑیوں کے تالے کھول سکو وہاں سے قیدیوں کو نکال کر میری کوٹھڑی میں جمع کرو۔ اور

دروازے اسی طرح بند کرتے جاؤ۔ اور دیکھو ہمیں اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسرے قیدیوں

کو بھی یہاں سے نکالنا ہے۔"

چند منٹ میں معظم علی کے آٹھ ساتھیوں کے علاوہ بارہ اور قیدی اس کی کوٹھڑی میں جمع

ہو چکے تھے۔ صرف آخری سرے پر تین کوٹھڑیاں باقی تھیں جن کے اندر پانچ پانچ قیدی

بند تھے۔



معظم علی نے ایک کوٹھڑی کا تالا ابھی کھولا ہی تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: "پہرہ گشت کے لیے آرہے ہیں!"

معظم علی نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور اکبر خاں کا بازو پکڑ کر فوراً اندر داخل ہو گیا قیدی دروازے پر منتظر تھے۔ معظم علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے اکبر خاں سے دریافت کیا۔

پہرہ دار کتنے ہیں؟

صرف دو! اس نے جواب دیا۔

معظم علی نے کوٹھڑی کے قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "تم میں سے تین مضبوط آدمی میرے ساتھ آجائیں۔ ہم پہرہ داروں کو چیخ پکار کا موقع دیتے بغیر اس کوٹھڑی میں بند کریں گے۔ لیکن یاد رکھو۔ تمہاری ذرا سی کوتاہی ہمارا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گی۔"

اس کے بعد معظم علی نے دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر میں پہرہ داروں کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ جن بی دہ باتیں کرتے ہوئے کوٹھڑی کے سامنے پہنچے۔ معظم علی اچانک آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک کا گلا دبوچ کر کوٹھڑی کے اندر گھسیٹ لایا۔ دوسرے آدمی کے منہ سے صرف "کیا ہے" نکلنے پایا تھا کہ ایک قیدی نے بڑھ کر اس کی گردن دبا لی اور باقی دو نے اسے گھونسوں اور ٹکٹوں سے ادھ موا کر کے کوٹھڑی کے اندر ڈال دیا۔

تاریکی میں معظم علی کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ گرفتاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کوئی ان کی قمیص بھاڑ کر ان کے منہ میں ٹھونس رہا تھا تو کوئی ان کی پگڑیاں اتار کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کوئی لاتوں اور ٹکٹوں سے ان کی توابع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

معظم علی نے کہا: "بھائی! کیسنا اندھیرے میں اپنے کسی ساتھی کو نہ مار دینا!"

پہرہ داروں کی ہندوؤں اور تواریوں پر قبضہ کرنے کے بعد معظم علی قیدیوں کو لے کر باہر نکلا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا۔ باقی دو کوٹھڑیوں سے قیدیوں کو نکالنے میں اسے دیر

نہ لگی جب تمام قیدی معظم علی کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے تو اس نے اکبر خاں سے کہا: "اکبر! تم نے ہمیں قید سے نکالا ہے۔ اب باہر نکلنے کے لیے بھی میں تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنا ممکن نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے صرف دو ہی راستے ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم یا تو پچھلی دیوار میں عقب نگاہیں یا چھت پر چڑھ کر پچھواڑے کی طرف دوسری حویلی میں کود جائیں۔ پچھواڑے کی حویلی میں غلے کے گودام اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس پہرہ دار ہیں۔ ہمارے پاس صرف دو بندو قیں اور دو تواری ہیں۔ میں مرلی دت کی ہندوق، توار، پستول اور بانو کا تھیلا بھی لا کر آپ کو لے سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہم اچانک ان خیموں پر حملہ کر کے پہرہ داروں کو مغلوب کر لیں تو ہم چند بندو قیں اور تواریں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ساتھ دالی حویلی کے پہرہ داروں کو مغلوب کرنا ہمارے لیے آسان ہو گا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں! ہمارے لیے دوسری حویلی سے ہتھیار حاصل کرنا زیادہ آسان ہو گا۔ ان کوٹھڑیوں کی چھت زیادہ اونچی نہیں اور ہم آسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اکبر خاں! سب سے پہلے تمہاری باری ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

کوٹھڑی سے باہر نکل کر معظم علی نے دیوار کے قریب جھکے ہوئے کہا: "تم میرے کندھے پر سوار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔"

اکبر خاں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن اس کے ہاتھ چھت کی منڈیر تک نہ پہنچ سکے۔ معظم علی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے گھٹنے پکڑ کر اپنے بازو اور پراٹھائے اور اکبر منڈیر پکڑ کر چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد معظم علی نے اسی طرح ایک اور آدمی کو چھت پر چڑھایا اور پھر باقی تمام آدمیوں کو اسی طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان کی آن میں تمام آدمی چھت پر چڑھ گئے۔ نیچے آخری آدمی معظم علی تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی پگڑیوں کا رتسا بنا کر نیچے لٹکا دیا۔ معظم علی نے بڑے اطمینان

کے ساتھ کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور گڑیوں کے سہارے چھت پر چڑھ گیا۔

اس چھت سے آگے دوسری حویلی کے مکانات کی چھتیں قریباً ایک گز نیچی تھیں۔ معظم علی اپنے ساتھیوں کو دیں رکنے کا حکم دے کر مولا دھار بادش میں گھنٹوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ دوسری چھت کی منڈیر کے قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے صحن کا جائزہ لیا اس حویلی کا بیشتر حصہ تاریک تھا۔ دائیں ہاتھ کی دیوار کے درمیان ایک کشادہ ڈیوڑھی میں ایک مشعل جل رہی تھی جس کی روشنی میں ڈیوڑھی سے آگے ایک چھپر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ چھپر کے نیچے چند آدمی کھائوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور وہ آگے بڑھ کر ایک لمبی قطار میں منڈر کے پیچھے لیٹ گئے۔ معظم علی نے پہلے اکبر خاں کو نیچے لٹکا یا پھر خود منڈر کے ساتھ لٹک کر اتر گیا۔ قوڑی دیر میں اس کے تمام ساتھی کسی وقت کے بغیر دوسری حویلی کے صحن میں پہنچ گئے۔ معظم علی نے باقی آدمیوں کو دیں قہر نے کا حکم دیا اور اکبر خاں کے علاوہ تین اور ساتھیوں

کے ہمراہ پانی اندر کپڑے میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے روشن حصے کی طرف بڑھا۔ چھپر کے نیچے دو چلہ پائیوں کے درمیان خلی بکریں سے گزر کر یوگ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے اندر دو آدمی کھائوں پر اور سات آدمی فرش پر سو رہے تھے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک مشعل جل رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی تیل کی کچی پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ ایک کھاٹ کے سرٹانے دیوار کے ساتھ چند بندو قیں اور بارود کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو ان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ فرش پر لیٹے ہوئے آدمیوں سے پاؤں بچاتے ہوئے آگے بڑھے اور بندو قیں اٹھا کر دیے پاؤں بائیں لگائے۔ معظم علی نے مشعل اٹھائی اور اس پر کچی سے تیل ڈالنے کے بعد واپس مڑا۔ ڈیوڑھی سے چھپر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے دائیں بائیں چھ آدمی چارپائیوں پر سو رہے ہیں اور ان چارپائیوں سے آگے دونوں طرف چھپے کے نیچے گھوڑوں کی کھریاں ہیں۔ معظم علی نے مشعل بند کر کے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا اور ان کی آن میں اس کے ساتھی آگے بڑھ کر ڈیوڑھی

کے سامنے جمع ہو گئے۔ چند آدمی معظم علی کے اشارے پر ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں گھوڑے بدرجاس ہو کر کھلبلی بجا رہے تھے۔ چھپر کے نیچے لیٹے ہوئے تین آدمی کچے بعد بکریے بڑبڑا کر اٹھے۔ لیکن معظم علی کے ساتھیوں نے انہیں بندو قوں کے کندوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ ایک پہریلار نے چینی کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کا گلا دبا دیا۔ ڈیوڑھی کے اندر اور چھپر کے نیچے باقی پہریلار انتہائی پریشانی اور خوف کی حالت میں ان غیر متوقع حملہ آوروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

معظم علی نے کہا: یہ گاؤں ہمارے حاضر میں ہے۔ قہارے لیے اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اگر کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ تمہاری بہتری یہاں میں ہے کہ تم بلا چون و چرا ہمارے حکم کی تعمیل کرو!

قوڑی دیر بعد معظم علی کے ساتھی پہریلاروں کو ہانک کر نکلنے کے ایک گودام میں بند رہ چکے تھے۔ معظم علی گودام کا دروازہ بند کر رہا تھا کہ اکبر خاں بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا: بھائی جان! حویلی کے چھانک میں قتل لگا ہوا ہے، آپ ان سے چابی لے لیں۔

”چابی کس کے پاس ہے؟“ معظم علی نے دوبارہ کہا۔ میں حویلی کی چابی مانگتا ہوں۔ اگر ایک منٹ کے اندر اندر چابی ہمارے حوالہ نہ کی گئی تو اس گودام کو آگ لگا دی جائے گی۔“

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے کچھ کہے بغیر ایک چابی معظم علی کے ہاتھ میں دے دی۔ معظم علی دروازے کی کدھڑی لگانے کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دو آدمی پہلے دروازے کے پاس کھڑے رہیں اگر یوگ شہر چائیں۔ تو اس حویلی کو آگ لگا دی جائے اور باقی فوراً گھوڑوں پر سوار ہو جائیں!

حویلی کے صحن میں تین طرف دیواروں کے ساتھ چھپوں کے نیچے کوئی ڈیڑھ سو گھوڑے



ہو گیا۔ معظم علی کو ٹھہری خالی ہے۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خالی ہے؟ اس نے سراسیمہ ہو کر سوال کیا۔

”جناب میں نے ٹول کر دیکھا تو اس کا آلا غائب تھا۔ صرف کنڈی باہر سے بندھتی  
میں دروازہ کھول کر اندر گیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔“

مرلی دت نے سراپا فریادیں کر چوکی کے محافظ کی طرف دیکھا اور کہا: ”سرکار چابیوں  
کا گچھا غائب ہے۔“

چوکی کے محافظ نے کچھ کچے بغیر مرلی دت کے بستر سے اس کی بانسری اٹھائی اور اسے  
بے تماشاً پیٹنا شروع کر دیا:۔



علی وردی خاں، میدان پور کے سرکاری محل میں مقیم تھا اور اس کی فوج شہر سے باہر پڑاؤ  
ڈالے ہوئے تھی۔ ایک صبح وہ محل کے کشادہ کمرے میں بیٹھا اپنے میرمنشی کو درخواستوں اور  
مراسلوں کے جواب لکھوا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ ایک کرسی پر سراج الدولہ بیٹھا ہوا تھا۔  
محل کا داروغہ اندر داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ کر ایک مراسلہ  
پیش کیا۔

علی وردی خاں، میرمنشی کو چند جملے لکھوانے کے بعد داروغہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس  
نے کہا: ”عالیجاہ! یہ معظم علی کی درخواست ہے اور وہ اسی وقت قدربوسی کی اجازت چاہتا ہے۔“  
”معظم علی کون ہے؟“ علی وردی خاں نے مراسلہ کھولتے ہوئے سوال کیا۔

داروغہ نے جواب دیا: ”عالیجاہ! یہ دہی نوجوان ہے جسے صہور نے سرحدی علاقوں کا  
محافظ مقرر کیا تھا وہ مدت سے لاپتہ تھا اور اب مرٹوں کی قید سے فرار ہو کر یہاں  
پہنچا ہے۔“

علی وردی خاں نے جلدی لیے مراسلہ کھول کر پڑھا اور داروغہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا

اسے فوراً حاضر کر دیا۔

داروغہ سلام کر کے باہر نکل گیا۔ اور علی وردی خاں کی نگاہیں دوبارہ مراسلے پر مرکوز ہوئیں  
تھوڑی دیر بعد معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ علی وردی خاں نے اٹھ کر اس کے ساتھ گرجوٹی  
سے مصافحہ کیا اور سراج الدولہ نے اس کی تقلید کی۔ علی وردی خاں نے کہا: ”ہم تمہارے متعلق  
میلوس ہو چکے تھے۔ بیٹھو، اور مجھے اپنی سرگزشت سناؤ!“

معظم علی، علی وردی خاں کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس نے مختصراً اپنی سرگزشت بیان  
کر دی۔

انھوں نے علی وردی خاں نے کہا: ”کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ تم میر حبیب کی قید میں ہو۔  
تمہاری گرفتاری یقیناً عطاء اللہ خاں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت  
رہا ہے ہم اسے ملک چھوڑ چکے ہیں۔“

معظم علی نے قدسے توقف کے بعد کہا: ”مجھے یقین ہے کہ میری گرفتاری تمہا عطاء اللہ  
خاں کی سازش کا نتیجہ نہ تھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے۔“

علی وردی خاں نے جواب دیا: ”سازش درحقیقت ہمارے خلاف تھی اور عطاء اللہ  
خاں کے جن ساتھیوں پر ہمیں شبہ تھا وہ سب فوج سے نکلے جا چکے ہیں۔ میر جعفر نے  
ہمیں بتایا تھا کہ ان کے دل میں عطاء اللہ خاں کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے اور  
انھوں نے تمہیں فوج کی حفاظت کے بغیر سفر کرنے سے منع کیا تھا۔“

”عالیجاہ! انھوں نے مجھے منع ضرور کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ  
ابتداء سے ہی عطاء اللہ خاں کے رازدار نہیں تھے۔“

علی وردی خاں نے قدسے آزدہ ہو کر جواب دیا: ”اگر وہ عطاء اللہ خاں کے رازدار  
بن کر ہمیں بد وقت اس کے ارادوں سے باخبر نہ کرتے تو آڑیہ میں ہمیں انتہائی خطرناک

صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہر حال اگر تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری گرفتاری کے صحیح اسباب معلوم

ہیں اس کی دشمنی کی بجائے اس کی دوستی کی ضرورت ہے۔

معظم علی نے جواب دیا: ”میر حبیب کی دوستی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک معمولی سپاہی کی ضرورت نہیں۔ اگر موجودہ حالات مجھے ایک حقیقت پسند انسان بننے سے منع کرتے ہیں تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ہماری قسمت کے امین دوست اور دشمن میں تیز کر سکیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے!“

معظم علی یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

علی دردی خاں چند ثانیے غصے — اور غصے سے زیادہ پریشانی اور اضطراب کی حالت میں معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: معظم علی! میں اپنی تلوار کا نوہا پھانتا ہوں تمہارا استعفا منظور نہیں کیا جائے گا۔ ایک طویل عرصہ مرہٹوں کی قید میں رہنے کے بعد تم چھ ماہ کی رخصت کے حق دار ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم اس عرصہ میں یہ سمجھ سکو گے کہ میرا یہ اقدام صحیح تھا۔ مرہٹوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے میر حبیب کو قابو میں لانا ضروری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔

معظم علی باہر نکل گیا اور علی دردی خاں سراج الدولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

سراج الدولہ نے کہا: ”جہاں پناہ اگستاخ ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپاہی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد بھی شاید ہماری فوج میں دوبارہ اپنا پسند نہ کرے۔“

علی دردی خاں مسکرایا: ”وہ خود علی کا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی اگر میں کسی محاذ پر جانا پڑے تو وہ گھر جانے کی بجائے ہماری اگلی صف میں لڑنا پسند کرے گا۔ تم جاؤ اور اسے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کرو۔ کسی دن وہ تمہارے ترکش کا بہترین تیر ثابت ہو گا۔“

سراج الدولہ نے کہا: ”تو آپ اس سے خفا نہیں ہوئے؟“

علی دردی خاں نے منوم ہجے میں کہا: ”خفا؟ ایک بوڑھا اپنی لامٹی سے ایک سپاہی اپنی تلوار سے، ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک فرمانروا اپنے عصائے حکمرانی سے کیونکر خفا ہو سکتا ہے۔ ہاں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جب وہ انتہائی اشتعال کی حالت میں بول رہا تھا تو میں نے اگے بڑھ کر بیٹھنے سے کیوں نہ لگا لیا۔ کاش! میرے بول جانے میں اس قسم کی تلواریں اور سب ہتھیار اور میں ہر محاذ پر ہر دشمن کو شکست دے سکتا۔ لیکن جب تمہارا وقت آئے گا تو مجھے یقین ہے کہ جنگال کے حالات اس سے مختلف ہوں گے۔ معظم علی! میرے فوجیوں کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نئی قوم جنم لے گی۔ تم جاؤ اور کشتی سے کہو کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کے زلنے کی پوری تنخواہ ادا کر دی جائے۔ ہم ایک ہفتہ تک مرشد آباد پہنچ جائیں گے اور وہاں میں یہ کوشش کروں گا کہ اسے تمہاری محافظ فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا جائے۔“

سراج الدولہ کمرے سے نکلا اور محل کے دروازے پر معظم علی سے جا ملا اور اس نے اسے آواز سے کر روتے ہوئے کہا: مجھے آپ سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ”فرمائیے! معظم علی نے کہا۔“

سراج الدولہ نے کہا: ”میں یہاں سے سیوا، اگلی جا رہا ہوں اور شاید کچھ عرصہ مرشد آباد نہ آ سکوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مستعفی ہونے کے متعلق اپنا ارادہ تبدیل کر سکیں تو سیدھے میرے پاس آئیں مجھے وہاں اپنی فوج کے لیے قابل اعتماد افسروں کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے قابل اعتماد سمجھتے ہیں؟ معظم علی نے مسکرا کر سوال کیا۔“

سراج الدولہ نے جواب دیا: ”اگر میں آپ کو قابل اعتماد نہ سمجھتا تو دور نہ تھا کہ آپ کے پیچھے نہ آتا۔ چلیے ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

معظم علی اس کے ساتھ محل کے ایک کمرے میں داخل ہوا اور وہ قریباً دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت سراج الدولہ نے اس کے ساتھ گرجی سے مصافحہ کرتے



دئے کہا: کیا میں یہ توقع رکھوں کہ چند دنوں یا چند ہفتوں کے بعد آپ میرے پاس پہنچ جائیں گے؟  
معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ سے صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر مستفی ہونے کے  
متعلق میں نے اپنا ارادہ تبدیل کیا تو کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا آپ کے  
پاس آؤں گا۔"

سراج الدولہ نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ آپ کا ارادہ بہت جلد بدل جائے گا۔"  
تھوڑی دیر بعد معظم علی بارہ سواروں کے ہمراہ مرشد آباد کا رخ کر رہا تھا۔ اور ان میں سے  
آٹھ وہ تھے جو معظم علی کے ساتھ قید ہوئے تھے۔ باقی راستے کی مختلف منازل پر اس کا ساتھ  
چھوڑ چکے تھے۔

میدان پور چند گھنٹے قیام کے دوران میں معظم علی اپنے اور مرزا حسین بیگ کے گھر کی  
خیریت معلوم کر چکا تھا۔ اس کے محلے کا ایک سپاہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اس کا باپ مرشد آباد  
میں ہے۔ اس کا بھائی یوسف اس کے ردپوش ہونے کے بعد عظیم آباد سے مرشد آباد آ گیا تھا  
اور اب میرمدن نے ڈھاکہ کی فوجداری سنبھالنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا لیا ہے، فضل بیگ  
مرشد آباد میں ہے۔

مرشد آباد سے میرمدن کی تیلی کی خبر اس کے لیے پریشان کن تھی۔ لیکن فوج کے ایک  
افسر سے تبادلہ خیالات کے بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ میرمدن نے مرشد آباد کے بعض اہل خاص  
میرحضر سے شدید اختلافات کے باعث، علی وردی خاں سے یہ درخواست کی تھی کہ اسے  
ڈھاکہ بھیج دیا جائے۔

## آٹھواں باب

آمنہ بالا خانے کے ایک کمرے میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پڑھ رہی تھی کہ صابر بھائی  
ہوا زمانہ مکان کے صحن میں داخل ہوا اور پوری طاقت کے ساتھ چلانے لگا۔ "معظم علی آگیا!"  
معظم علی آگیا!

آمنہ قرآن بند کر کے اٹھی، لیکن اس میں بولنے یا چلنے کی ہمت نہ تھی۔ نیچے خادما صابر  
کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ "کہاں ہے معظم علی؟ خدا کے لیے بتاؤ کہاں ہے؟ لیکن  
وہ اس کی طرف توجہ دیتے بغیر بالا خانے کی طرف منہ اٹھا کر بدستور چلا رہا تھا: بی بی جی! بی بی  
جی!! معظم علی آگیا۔ معظم علی آگیا!"

معظم علی، اکبر خاں کے ساتھ صحن میں داخل ہوا اور خادمہ بھاگ کر بالا خانے کی شیشوں  
پر چڑھنے لگی۔ "بی بی جی! معظم علی....!" اس نے پوری قوت سے چلانے کی کوشش کی لیکن  
اس کی آواز حلق میں بیٹھ گئی۔

آمنہ ٹکھراتی ہوئی درپے کی طرف بڑھی۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھا، اور تیزی  
سے قدم اٹھاتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چند تانیے بعد وہ اپنی ماں کے سامنے کھڑا تھا اور  
وہ ایک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"امی جان میں سگیا ہوں!" معظم علی نے بھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ماں کی آنکھوں میں  
آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔

میرالال۔ میرا بیٹا! اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔  
معظم علی بے اختیار ماں کے ساتھ لپٹ گیا۔ آمنہ اب بڑی مشکل سے اپنی چیمیں  
ضبط کر رہی تھی۔

میرے چاند۔ میرے لال! مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے۔ میں ہر روز تمہیں خواب  
میں دیکھا کرتی تھی۔

اباجان کہاں ہیں؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

وہ مسجد میں غدا پڑھنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ کہہ کر آمنہ خادمہ کی طرف  
متوجہ ہوئی جو دروازے میں کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ تم جلدی سے ناشتہ تیار کرو اور  
صابرے کو ان کے اباجان کو اطلاع دے دے۔

صابر جا چکا ہے۔“ خادمہ یہ کہہ کر نیچے چلی گئی۔

ماں اور بیٹا قالمین پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ماں نے اس کے سر پر  
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ تم کہاں تھے بیٹا؟

امی جان میں مرٹوں کی قید میں تھا۔ معظم علی یہ کہہ کر اٹھا اور دریچے کے قریب جا کر  
وازدی۔ اکبر خاں! تم نیچے کیوں کھڑے ہو اور آ جاؤ!  
اکبر خاں کون ہے؟ ماں نے سوال کیا۔

معظم علی نے مسکرا کر جواب دیا۔ امی جان آپ کے لیے ایک اور بیٹا لایا ہوں۔ وہ میرے  
ساتھ قید تھا اور میں اسی کی وجہ سے رہا ہوا ہوں۔

اکبر خاں جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے معظم علی کی ماں کو سلام کیا۔  
آمنہ نے جواب دیا۔ جیتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھ جاؤ!

کوئی دس منٹ بعد نیچے صحن سے محمود علی کی آواز آئی۔ کہاں ہے معظم علی؟  
معظم علی اٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اتر آیا اور بے اختیار اپنے باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بالا خانے کے اسی کمرے میں بیٹھ کر آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹوں  
کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی، ماں اور باپ کے ان گنت مولات  
کے جواب میں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

صابر نے سر پھینوں سے آواز دی۔ مرزا حسین بیگ آئے ہیں۔

انہیں اوپر لے آؤ۔ محمود علی نے کہا۔

ان کے ساتھ اور آدمی بھی ہیں۔ صابر نے جواب دیا۔

اچھا انہیں دیوانخانے میں بٹھاؤ، ہم آتے ہیں۔

جب معظم علی اور اس کا باپ نیچے اترنے لگے تو اکبر خاں ان کے پیچھے ہولیا۔

آمنہ نے کہا۔ تم کہاں جاؤ گے بیٹا! تم یہیں بیٹھو۔ میں تم سے تمام واقعات سننا  
چاہتی ہوں۔

مرزا حسین بیگ اور غنہ کے دوسرے لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد معظم علی واپس  
آیا تو اکبر خاں قالمین پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ خادمہ ناشتہ لے کر آئی تو معظم علی، اکبر خاں کو جگانے  
لگا۔ لیکن ماں نے کہا۔ بیٹا اسے نہ جگاؤ۔ میں اسے ناشتہ کھلا چکی ہوں۔

محمود علی نے جلدی سے ناشتہ کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ معظم! مجھے آج دفتر میں چند  
ضروری کام ہیں۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ اتنی دیر تم اپنی ماں سے باتیں کرو۔ میں اس  
کو ابھی پیغام بھیجتا ہوں کہ وہ بھی ایک دو دن کی چھٹی لے کر گھر آ جائے۔

محمود علی کے جانے کے بعد معظم دریک اپنی ماں کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا  
بالآخر اس نے پوچھا۔ امی جان! فرحت اور اس کی امی کیسی ہیں؟

وہ بہت خوش ہیں بیٹا! ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی  
اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

”کیا ہوا امی جان؟“ معظم علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔



کچھ نہیں بیٹا! ماں نے آنسو پونچتے ہوئے جواب دیا۔ "تم مرزا صاحب سے

مل آئے ہوتا؟

ہاں امی جان! لیکن افضل مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ مرزا صاحب کہتے تھے وہ کل شکار پر چلا گیا ہے میرا خیال ہے میں جی جان کو سلام کراؤں۔

ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔

معظم علی نے پوچھا۔ اتنی جان فرحت کی اتنی آپ سے ملا کرتی ہیں نا؟

ہاں بیٹا! کبھی میں ان کے یہاں چلی جاتی ہوں اور کبھی وہ ہمارے یہاں آجایا کرتی ہیں۔ پہلے فرحت بھی ان کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ گھر سے نہیں نکلتی۔

امی جان! کیا بات ہے، آپ مفوم کیوں ہو گئیں؟

کچھ نہیں بیٹا! ماں نے ابدیہ ہو کر کہا۔ "کاش تم وہ مہینے پہلے آجاتے۔"

اور معظم علی انتہائی اضطراب کی حالت میں ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے قدے وقف کے بعد کہا۔ بیٹا! فرحت کی ملگلی ہو چکی ہے۔

ایک ثانیے کے لیے معظم علی نے محسوس کیا کہ کائنات کے نظام میں یکایک ٹھہراؤ آ

گیا ہے اور زمانے کی ایک ٹھوکر نے اسے امیدوں، آنسوؤں، انگلیوں اور دلوں کے حسین

اور سدا بہار نختوں سے نکال کر ایک بے آب و گیاہ صحرا کی بھیا تک دستوں میں

پھینک دیا ہے۔

فرحت کی ملگنی ہو چکی ہے۔ یہ چند الفاظ معظم کے لیے حال اور مستقبل کی اس داستان

کا عنوان تھے جو نفوس، مسکراہٹوں اور قہقروں سے خالی تھی۔ وہ رنگین پسٹوں، دلچسپ نظاروں

اور دکش نفوس کی حسین راویوں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا جس کی صحن سوچ

کی ضیاء پاشیوں سے اور جس کی راہیں ساروں کی مسکراہٹوں اور چاند کے قہقروں سے

محروم تھیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ماں کے لیے یہ مسکراہٹ بڑا دل آسنوں سے

زیادہ دبدبناک تھی۔ معظم علی نے سنبھل کر کہا۔ امی جان! آپ فرحت کی ملگنی پر خوش نہیں ہیں؟

اور ماں نے جواب دینے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

بیٹا! اس نے اس کے چہرے پر ہلارے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مرزا حسین بیگ

کو تمہارا بہت خیال تھا۔ لڑکے والے کئی باباں کے یہاں آئے۔ لیکن وہ ہر بار انکار کرتے رہتے

پھر جب وہ تمہارے متعلق مایوس ہو گئے تو افضل نے ہاں کر دی۔ اس بات کو ایک مہینہ ہوا ہے۔

میں ملگنی کے دن ان کے ہاں گئی تھی۔ شہر کے امرا کی بیویاں دہاں جمع تھیں۔ میں نے جب فرحت

کی ماں کو مبارک باد دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے کہا: بہن خدا کو منگھو

نہ تھا۔ ورنہ مرزا صاحب یہ فیصلہ کر چکے تھے، کہ فرحت آپ کی ہے۔ اب آپ میری بیٹی کے

لیے دعا کریں۔ اس کے بعد جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ

فرحت میری بیٹی ہے اور وہ نوجوان جس کے ساتھ اس کی ملگنی ہو رہی ہے، صرف عابو کا ہی

نہیں بلکہ میرا بھی داماد ہے۔

جس وقت ماں بیٹے آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے۔ فرحت اپنے مکان کے ایک

کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک بے تکلف سہیلی جس کا نام ناصرہ تھا، کمرے میں داخل

ہوئی اور اس نے دبے پاؤں فرحت کے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں

اور کہا: بھلا بتاؤ میں کون ہوں؟

"چھوڑو ناصرہ مجھے تنگ نہ کر دو۔" فرحت نے مفوم آواز میں جواب دیا۔

"غلط! بالکل غلط!! ناصرہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا: میں ناصرہ نہیں ہوں میں

معظم علی ہوں۔ سنتی ہو میرا نام معظم علی ہے یہ۔"

"ناصرہ خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کر دو۔" اس نے انسانی مفوم بچے میں کہا۔

ناصرہ قدے نام ہی ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فرحت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبرزد کی

کر اس نے کہا: فرحت تھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ابا جان اب اپنا خیال بدل دیں گے۔

”ناصر خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔ میں ابا جان کو سارے ملک میں رسوا کرنے کی بجائے اس مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دینا آسان سمجھتی ہوں۔“

لیکن معظم علی آگیا ہے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔“

فرحت نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا: معظم علی آگیا ہے لیکن فرحت اس کے لیے مرگئی ہے۔ فرحت اس دن مر گئی تھی جس دن اس نے مگنی کا جوڑا پہنا تھا اور اب میرے والدین مجھے معظم علی کے لیے قبر سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

معظم علی کے دل میں تنہائی اور بے کسی کا احساس بڑھتا گیا۔ گھر سے باہر مرشد آباد کی گلیاں اسے اداس نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ حسین بیگ کے پاس جاتا۔ حسین بیگ اس کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آتا۔ اس کے ساتھ افضل کا برتاؤ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ لیکن معظم علی ہر ملاقات کے بعد اپنے دل پر ایک بوجھ محسوس کرتا ہوا گھر واپس آتا۔ پانچ دن بعد یوسف علی آیا اور دو دن گھر رہ کر واپس چلا گیا۔

قید سے واپس ہونے کے بعد اس نے ابراہیم خان سے وعدہ کیا تھا کہ مرشد آباد پہنچتے ہی میں تمہیں روٹیکھنڈ پہنچانے کا انتظام کروں گا۔ اور ابراہیم خان نے جب دس دن اس کے گھر ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا: ابراہیم خان تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میں خود تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

ابراہیم خان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا: جانی جان! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں چند بجتے اور یہاں ٹھہر سکتا ہوں۔“

چوتھے روز علی اصباح معظم علی، ابراہیم خان کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند دن سفر کرنے کے

بعد وہ اودھ کی سرحد سے دس میل دور روٹیکھنڈ کے چرواہوں اور کسانوں کی چند سیٹیاں عبور کرنے کے بعد ایک ٹیلے پر گھوڑے روک کر اپنے سامنے ایک سرسبز شاداب اُدی دیکھ رہے تھے۔ ابراہیم خان نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ میرا گاؤں ہے!“

پہلے وہ ٹیلے سے اتر کر کچھ دیر ایک گھنے جنگل سے گزرنے کے بعد گندم کے مسماتے بونے کھیتوں میں داخل ہوئے اور ابراہیم خان نے کہا: ”یہ ہماری زمین ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں میں داخل ہوئے اور ان کی آن میں گاؤں کی خاموش گلیاں ابراہیم خان آگیا۔ ابراہیم خان ”آگیا“ کے نعرے کو گونج اٹھیں۔ بچے، بوڑھے اور جوان ان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ گھوڑوں سے اتر پڑے گاؤں کا ہر شخص ابراہیم خان کو دیکھنے، اس سے گفتگو کرنے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ ہجوم ایک قلعہ نما مکان کے سامنے رکا اور ابراہیم خان نے معظم علی سے کہا: ”بھائی جان! یہ ہمارا گھر ہے۔“

ایک خوش وضع نوجوان دروازے سے نمودار ہوا اور لوگوں کو ادھر ادھر بٹاتے ہوئے آگے بڑھ کر ابراہیم خان سے بیٹھ گیا۔ یہ ابراہیم خان کا بڑا بھائی اطہر خان تھا۔

چند دن بعد معظم علی اس علاقے کے کسی آدمی کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ابراہیم خان کے قبیلے کا بچہ بڑھا اسے اپنا محسن خیال کرتا تھا۔ اطہر خان جو اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کا سردار تھا، معظم علی کا بے تکلف دوست بن گیا تھا۔

یہ گاؤں اور اس کے ارد گرد دس اور سیٹیاں، بنگشن افغانوں کے لوگوں سے آباد تھیں اور وہ سب ابراہیم خان کے خاندان کی سرداری تسلیم کرتے تھے۔ روٹیکھنڈ کے دوسرے افغانوں کی طرح یہ لوگ اچھے کاشت کار اور چرواہے ہونے کے علاوہ بہترین سپاہیاء و صلاحتوں کے مالک تھے۔ ہیردنی حمداوردوں بالخصوص مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے ہر روز سیلہ نوزائے نشاء بازی، تیغ زنی اور شہسواری میں کمال حاصل کرنا اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ جب ہندوستان کے باقی علاقوں کو بے جیا سیاسی شاطروں اور حلیصہ قسمت آزمائوں نے نکت و اندلس کے



جہنم میں جوں تک دیا تھا یہ لوگ اپنی محنت و مشقت سے فراغت اور خوشحالی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے میں مصروف تھے اور جب بڑے بڑے صوبوں کے عیش پرست حکمرانوں کی افواج اپنی رعایا کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے بچانے سے قاصر تھیں، یہ لوگ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو رہے تھے۔

معظم علی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھہرنے کی نیت سے آیا تھا، لیکن اس نے تین مہینے یہاں گزار دیئے۔ ابتدا میں کبھی کبھی وہ اطہر خاں اور اکبر کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ جب شکار سے اس کا جی بھر گیا تو گاؤں کے لوگوں کے ساتھ تیراندازی، نیزہ بازی اور تیغ زنی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔

تین ماہ بعد جب وہ اطہر خاں اور اکبر خاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں سے جدا ہو رہا ہے۔ اطہر اکبر اور علاقے کے چند اراکسی اور دھ کی سرحد تک اسے چھوڑنے کے لیے آئے۔ اکبر خاں کے ساتھ جب وہ مصافحہ کر رہا تھا تو اس نے آبدیدہ ہو کر کہا: ”بھائی جان، آپ پھر کب آئیں گے؟“ مجھے معلوم نہیں، اکبر خاں! ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج کے بعد میں اس زندگی میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکوں۔“

اکبر خاں سے رخصت ہو کر معظم علی نے اگرہ اور دلی کا رخ کیا۔ دلی سے واپسی پر کچھ عرصہ مکھنو ٹھہرا اور بالآخر اپنے ساتھ مسلمانوں کی زبوں حالی کی دلخراش داستانیں لیے گھر پہنچا۔



گھر میں معظم علی کو سکون نصیب نہ ہوا کچھ عرصہ وہ بیکاری کے لمحات کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا رہا۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کی طبیعت کتابوں سے بھی اچاٹ ہو گئی۔ ایک دن اس کا بھائی یوسف علی رخصت پر گھر آیا اور ایک ہفتہ رہ کر واپس چلا گیا۔ جب معظم علی

کے رخصت کے دن غم ہونے کے قریب آرہے تھے تو اس نے چند بار استغفار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھا تو اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سراج الدولہ مرشد آباد آیا ہوا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا: ”کہتے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ معظم علی نے جواب دیا: ”میں چند دنوں سے ہنگی پہنچنے کا ارادہ کر رہا تھا۔“

سراج الدولہ نے کہا: ”میری یہ خواہش ہے کہ ہنگی کے قلعے کی کمان آپ کے سپرد کردی جائے میں ایک ہفتہ تک واپس جا رہا ہوں اس لیے آپ تیار رہیں۔“ معظم علی نے جواب دیا اگر ہنگی کے قلعے کے لیے آپ میری ضرورت محسوس کرتے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ انتظار کرنے کی بجائے کل ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔“ بہت اچھا! شام تک آپ کے پاس میرا حکم نامہ پہنچ جائے گا۔“

اگلے دن علی الصباح معظم علی ہنگی کا رخ کر رہا تھا اور چند دن بعد ہنگی کے قلعے کے آرام طلب سپاہی اور افسر ایک دوسرے سے شکایت کر رہے تھے کہ نیا کماندار ہمیں ایک لمحے کیلئے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ معظم علی ایک سال بعد چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے والدین اور مرزا حسین بیگ کی یہ خواہش تھی کہ وہ شادی کی تاریخ تک واپس نہ جائے۔ چنانچہ اس نے سراج الدولہ کو لکھا کہ مجھے تین ہفتے اور مرشد آباد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس خط کا جواب آنے سے پہلے اڑیسہ میں ایک نئے انقلاب کی خبر آگئی اور وہ یہ تھی کہ مرہٹوں نے اچانک حملہ کر کے میر حبیب کو، جسے علی وردہ خاں نے مرہٹوں سے مصالحت کی خاطر کنگ کا فوجدار تسلیم کیا تھا، قتل کر دیا ہے اور ان کی افواج اڑیسہ کے بیشتر اضلاع پر قابض ہو چکی ہیں۔

معظم علی کو اپنے باپ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ علی وردی خاں نے مرشد آباد کی فوج کو کوچ کی تیاری کا حکم دیا ہے اور ڈھاکر اور ہنگی کے فوجداروں کو یہ فرمان بھیجا ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اپنی

افواج لیے کراڑ لیسر کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ معظم علی نے کسی توقف کے بغیر ہنگامی کارخ کیا۔ دو ہفتوں کے بعد ہنگامی اور مرشد آباد کی فوج کنگ سے چند منزل دور پڑاؤ ڈال کر دھاک سے میرمدن کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمود علی اور افضل بیگ مرشد آباد کی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ پانچ دن بعد میرمدن بھی پانچ ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ جب میرمدن کی فوج پڑاؤ میں داخل ہوئی تو فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے میرمدن نے گھوڑے سے اتر کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ جب معظم علی کی باری آئی تو اس نے کہا: "معظم علی! تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی ہے۔ میں سراج الدولہ سے ملنے کے بعد تمہارے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں گا۔"

میرمدن ایک افسر کی رہنمائی میں سراج الدولہ کے خیمے کی طرف بڑھا اور افضل نے جو چند قدم دور کھڑا تھا معظم علی کو آواز دی: "معظم علی! تمہارے بھائی جان بھی آگئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟" معظم علی نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔ "وہ دیکھو۔" افضل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یوسف علی کوئی تیس قدم دور لشکر کے چند آدمیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ معظم علی اور افضل تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ یوسف علی نے ان کے ساتھ یکے بعد دیگرے مصافحہ کیا۔ اچانک افضل کو معظم علی کے پیچھے ایک اور نوجوان دکھائی دیا جو اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔

افضل نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا: "آپ یہاں کیسے آئے؟"

"میں دھاک کی فوج کے ساتھ آیا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

افضل نے کہا: "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے قدرے آزدہ ہو کر جواب دیا: "اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ میں

اپنے ساتھ دوسرے رضا کار بھی لایا ہوں۔"

"معظم علی نے دبی زبان میں یوسف سے پوچھا: "بھائی جان یہ کون ہیں؟"

"یہ شوکت بیگ ہیں۔ جن کی افضل کی ہمیشہ کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ افضل نے شوکت بیگ کو معظم علی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: "یہ معظم علی ہیں، یوسف علی کے چھوٹے بھائی۔"

شوکت بیگ نے آگے بڑھ کر معظم علی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا نام شوکت بیگ ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں آپ کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ شوکت بیگ کھلتے ہوئے رنگ کا ایک قوی الجشہ نوجوان تھا اور چہرے سے اس کی عمر کوئی پچیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی، محمود علی، یوسف، افضل اور مرزا شوکت بیگ ایک خیمے میں بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اب تک معظم علی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ شوکت بیگ دھاک کے ایک بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے اور میرمدن کی فوج کے ساتھ اس کی آمد اس کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔ لیکن یوسف علی سے استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ذاتی فوج کے دو سو سپاہیوں کے ساتھ ایک رضا کار کی حیثیت میں میرمدن کے ساتھ آیا ہے۔ معظم علی کے نزدیک اس کا یہ جذبہ قابل قدر تھا اور اس نے شوکت بیگ سے مخاطب ہو کر کہا: "مرزا صاحب! آپ بنگال کے اُمرار کے لیے ایک بہت اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ درزاب تو حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انجمن خدات کا احساس تک باقی نہیں رہا۔"

شوکت بیگ نے جواب دیا: "اجتماعی خطرے کا مجھے بھی کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔ میں نے صرف آپ کی تقلید کی ہے۔ جب مرشد آباد پر حملہ ہوا تھا اور میں نے یہ سنا تھا کہ آپ نے اپنے محلے کے چند رضا کاروں کے ساتھ مرہٹوں کی ایک منظم فوج کے دانت کھٹے کر دیئے



تھے، تو میرے دل میں بھی اپنے مزارعین کو فوجی تربیت دینے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر ایک دفعہ جب مرزا حسین بیگ ہمارے یہاں تشریف لائے اور انھوں نے آپ کے شاندار کارنامے کی بے حد تعریف کرنے کے بعد مجھے بھی تبلیغ کی تو میرا خیال پختہ ہو گیا۔ ہمارا گھر ڈھاکے سے پندرہ میل دور ہے۔ مرزا صاحب اپنے خطوط میں بار بار یہ تاکید کیا کرتے تھے کہ ہمارے مکان کے گرد ایک مضبوط ضعیل اور ایک گہری خندق کا ہونا ضروری ہے اور میں نے اپنی کچھ کے مطابق مرزا صاحب کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے خاندان کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔

رات کے وقت جب معظم علی کو تنہائی میں اپنے بھائی یوسف کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے پوچھا: ”بھائی جان! مجھے تو مرشد آباد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اگلے مہینے فرحت کی شادی ہونے والی ہے؟“

یوسف نے جواب دیا: ”فرحت کی شادی اس مہم کے اختتام تک کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ مرزا حسین بیگ نے اڑیسہ کے حالات کی اطلاع ملنے ہی شوکت بیگ کے والد کو لکھا تھا کہ افضل فوج کے ساتھ اڑیسہ کی مہم پر جا رہا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ جب تک ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے فرحت کی شادی ملتوی کر دی جائے شوکت بیگ غالباً مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔“ یہ میرے مدین کے ساتھ آگیا ہے۔

معظم علی نے سوال کیا: ”آپ اس سے کب متعارف ہوئے؟“

”اس نے خود ہی ڈھاکہ میں تلاش کیا تھا۔ ایک دن یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے مرزا حسین بیگ نے لکھا ہے کہ میں آپ سے ملوں۔ شوکت بیگ اچھا آدمی ہے۔ ایک دن یہ مجھے اپنے گھر ہی لے گیا تھا۔ ان کا خاندان بہت با اثر ہے اور میرے مدین کے ساتھ اس

کے والد کے نہایت دوستانہ تعلقات میں ہے۔



چند ہفتے بنگال اور مرہٹہ افواج کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتیں رہیں، پھر مرہٹہ سپہ سالار جانوجی نے ایک شدید حملہ کے بعد بنگال کی فوج کو میدنا پور کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ بنگال کی فوج اب میدنا پور کو اپنا مستقر بن کر اڑیسہ کی شمالی سرحد کے آس پاس مرہٹوں کے اکادمی حملے روکنے پر اکتفا کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہاں بھی کر رہی تھی۔ پھر اچانک ایک دن یہ اطلاع آئی کہ مرہٹوں کے ساتھ بعض افغان سرداروں کے ساز باز کے باعث بہار کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے علی دردی خاں نے مرہٹہ سپہ سالار جانوجی کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر کے لشکر کو واپس بلایا۔ فوج کا کوئی سپاہی یا افسر اڑیسہ کا صوبہ اس طرح جانوجی کے حوالے کر دینے پر خوش نہ تھا۔ لیکن شوکت بیگ کے لیے یہ خبر انتہائی ناقابل برداشت تھی۔ میرے مدین نے اسے شروع سے چند جہمی قیدیوں کی نثرانی سونپ رکھی تھی اور اسے انتہائی کوشش کے باوجود کسی معمولی لڑائی میں بھی اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سنتے ہی انتہائی غم و غصہ کی حالت میں میرے مدین کے خیمے میں داخل ہوا اور اس پر برس پڑا: ”میرے صاحب میں یہاں مکھیاں مارنے نہیں آیا تھا۔ میرے آدمی گھر جا کر میرا مذاق اڑاتے گئے۔“

میرے مدین مسکرایا۔ میرے خیال میں تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کوئی سالار اشد ضرورت کے بغیر نا تجربہ کار رضا کار کو کسی مہم پر نہیں بھیج سکتا اور تمہیں معلوم ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ اکادمی جھڑپوں میں ہم نے صرف نہایت آزمودہ کار دستے بھیجے تھے۔ اگر باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی تو تمہیں یقیناً اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔“

معظم علی خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”آپ نے مجھے بلایا ہے؟“

ہاں۔ مجھے تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب بہار کے ہندو

حالات کے پیش نظر اڈیسہ کے متعلق جانوجی کے ساتھ تصفیہ کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مرہٹے کسی معاہدے پر قائم نہیں رہیں گے۔ بہار کے جنوب مغربی علاقوں کو ان کی دست دراز سے محفوظ رکھنے کے لیے سراج الدولہ کی نگاہ انتخاب تم پر پڑی ہے۔ اب اڈیسہ کی بجائے بہار کی جنوب مغربی سرحد کا آخری قلعہ تمہارا مستقر ہو گا۔ وہاں اس وقت تک اطراف کی کئی بستیاں مرہٹہ لیڈوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا: "میر صاحب! میں اس ہم میں معظم علی کا ساتھ دوں گا!" میردن نے جواب دیا: "نہیں، میں ایک رضا کار کو ایسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتا۔"

شوکت بیگ نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "میں آپ کے سامنے طعنہ اٹھاتا ہوں کہ جب تک معظم علی اس مہم سے فارغ ہو کر گھر نہیں جاتا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔" معظم علی نے کہا: "میں آپ کی ضد کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر جانوجی کے ساتھ کوئی مصافحہ ہو چکی ہے تو اس علاقے میں کسی باقاعدہ جنگ کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جنگل میں بکھرے ہوئے لیڈروں اور ہڈیوں سے بچنے کے لیے ہمیں انتہائی تجربہ کار سپاہیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کی بہادری کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لیے ہمیں نا تجربہ کار رضا کاروں کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اب گھر جانا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ آپ جنگلوں میں ہمارے ساتھ وقت ضائع کرنے کی بجائے وہاں بنگال کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔"

شوکت بیگ نے تدریس برہم ہو کر کہا: "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میری جان کو اس قدر قیمتی سمجھتے ہیں۔ لیکن میں دشمن کے ساتھ لڑنے کی نیت سے آیا ہوں!" پھر وہ میردن کی طرف متوجہ ہوا: "میر خیال ہے کہ ایک رضا کار کی حیثیت میں مرہٹوں سے لڑنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ معظم علی مجھے اپنا ساتھی بنانے سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ی جنگل میں مرہٹوں کا پیچھا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آخر آپ

میری جان ان سپاہیوں سے زیادہ قیمتی کیوں سمجھتے ہیں جو جنگ میں شہید ہو چکے ہیں؟ میردن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو میں منع نہیں کرتا۔ معظم علی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ!"

مستم علی نے جواب دیا: "بہت اچھا۔ لیکن میں نے فوجی تربیت آپ سے حاصل کی ہے اور میرے افسر اور سپاہی اکثر شاکی رہتے ہیں کہ میں نظم و ضبط کے معاملے میں بہت سخت ہوں۔ اس لیے جب تک یہ میری کمان میں ہیں انہیں یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ انہیں کسی ترجیحی سلوک کا مستحق سمجھا جائے گا۔"

میردن نے شوکت بیگ کی طرف دیکھا اور وہ بولا: "جناب میں جانتا ہوں کہ میں سیر و سیاحت کے لیے نہیں آیا۔"

تھوڑی دیر بعد جب محمود علی، پوسٹ اور افضل کو شوکت بیگ کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔

اگلے روز صبح دوہرا سوار معظم علی کی قیادت میں کوچ کے لیے تیار کھڑے تھے اور محمود علی اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا: "مستم! شوکت بیگ کا خیال رکھنا۔ اگر خدا خواستہ اسے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو ہم مرزا حسین بیگ کو مذدکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"



چند ماہ بعد معظم علی پھر ایک دور افتادہ قلعے میں مقیم تھا، اس عرصہ میں دشمن کے ساتھ اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ لیکن دور دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں سرچھٹے ایک جگہ سے ماکھا کر بھاگتے تو دوسری جگہ کسی دوسری بستی پر حملہ کر دیتے۔ معظم علی اپنی فوج کے باقاعدہ سپاہیوں اور افسروں سے کام لینا جانتا تھا، لیکن شوکت بیگ اور اس کے رضا کار ساتھیوں کی رفاقت اس کے لیے ایک مسرت تھی۔ وہ انہیں قلعے کی حفاظت فوج کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن شوکت بیگ ہر خطرناک مہم میں اس کا ساتھ دینے پر اصرار کیا کرتا تھا۔



ایک سزا آدی رات کے وقت معظم علی کو قلعے سے بیس میل دور دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اسی وقت پانچ سو سواروں کو تیاری کا حکم دیا۔ شوکت بیگ نے حسب معمول تہا جلتے پر اصرار کیا اور اس دفعہ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس مہم میں معظم علی کو احساس ہوا کہ یہ سادہ دل نوجوان حماقت کی حد تک بہادر ہے۔ اس لڑائی میں شوکت بیگ یہ ثابت کر چکا تھا کہ گولیوں کی بادش میں بھی وہ سینہ تان کھڑا ہو سکتا ہے اور پھر جب دشمن کے سپاہی شکست کھا کر جنگل میں بھاگ رہے تھے تو وہ معظم علی کے احکام کا انتظار کیے بغیر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ جن سپاہیوں نے اسے جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھوڑا دوڑاتے دیکھا تھا وہ شام کے وقت معظم علی سے یہ کہہ رہے تھے: یہ محض اتفاق ہے کہ یہ نوجوان زندہ واپس آیا ہے۔

جب شوکت بیگ کئی میل مرہٹوں کا تعاقب کرنے کے بعد واپس آیا تو اس نے معظم علی سے کہا: میں نے سات آدمی اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں لیکن انفس کو میرا گھوڑا تھک گیا تھا۔

معظم علی نے کہا: دیکھو شوکت! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تم بہادر ہو لیکن تم بلاوجہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہو۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تبھی مجبوراً تمہیں قلعے میں بند رکھنا پڑے گا۔ تمہارے آٹھ آدمی بلاوجہ مارے گئے ہیں۔

شوکت نے جواب دیا: لیکن ان آٹھ آدمیوں میں سے ہر ایک کم از کم دو مرہٹوں کو ساقط کر رہا ہے۔

معظم علی نے جواب دیا: اگر وہ آٹھ آدمی زندہ رہتے تو یقیناً اس سے بہتر نتائج پیدا کرتے۔

شوکت بیگ نے کہا: یہ میری پہلی لڑائی تھی۔ لیکن آئندہ کے لیے میں محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

معظم علی نے کہا: اس لڑائی میں تمہاری کارگزاری دیکھنے کے بعد اگر مجھے یہ یقین نہ ہوا ہوتا کہ تم ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہو تو میں آج ہی تمہیں واپس بھیج دیتا۔

اس واقعے سے چند ماہ بعد معظم علی کو قلعے کے جنوب میں تیس میل دور مرہٹوں کے ایک لشکر کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی اور اس نے اپنی دو تہائی فوج قلعے میں چھوڑ کر باقی سپاہیوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ آٹھ دن بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سو قیدی تھے۔ فوج کا ایک فہر اسے قلعے کے دروازے پر ملا اور اس نے مغوم بچے میں کہا: جناب مرزا شوکت بیگ زخمی ہیں اور ان کی حالت بہت خراب ہے۔

معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہی اس پر سوالوں کی بوجھا کر دی: کہاں ہیں وہ۔ وہ زخمی کیسے ہوئے۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟

انفرنے جواب دیا: وہ اپنے کمرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارا کہا نہیں ملا۔ کل ہمیں شمال کی طرف چند بستیوں میں مرہٹوں کے لوٹ مار کی اطلاع ملی تھی۔ نائب کمانڈر نے اسی وقت دو سو سوار روانہ کر دیئے۔ مرزا شوکت بیگ اس مہم میں حصہ لینے پر مصر تھے۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔

تم سب بوقوف ہو۔

معظم علی یہ کہہ کر بھاگتا ہوا قلعے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ شوکت بیگ بستر پر لیٹا کر رہا تھا۔ اس کے سینے، گردن اور بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ذہنی طبیب کے علاوہ چند انفرن اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور چند سپاہی کھڑے تھے۔ معظم علی نے کمرے میں داخل ہو کر شوکت بیگ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر طبیب کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا: زخم زیادہ شدید تو نہیں؟

طبیب نے جواب دیا: بہت شدید ہیں۔

معظم علی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے سالاروں کی طرف دیکھا اور کہا: میں

نے حکم دیا تھا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کی جائے اور اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم میں سے کس کی غفلت کا نتیجہ ہے؟

ایک سالار نے جواب دیا: ہم سب نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر میں احتیاطاً ڈیڑھ سو سپاہی لے کر ان کے پیچھے گیا تھا۔

رہنے ہمیں دیکھتے ہی جھاگ نکلے۔ ہم نے کوئی پانچ میل ان کا تعاقب کیا اس کے بعد جنگل زیادہ گنجان تھا اور میں نے سپاہیوں کو واپس کا حکم دیا۔ لیکن یہ مڑھوں کا بیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں مجبوراً ان کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور چیخ چیخ کر انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اچانک گھنے جنگل میں ایک ٹیلے کے پیچھے سے

گوہوں کی بوجھاڑ آئی اور ان کی آن میں ہمارے پچیس آدمی گر پڑے، اس کے بعد مرہٹے مقابلہ کرنے کی بجائے جنگل میں غائب ہو گئے۔ یہ بری طرح زخمی تھے۔ آپ ان کے آدمیوں سے پوچھ

سکتے ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کاش آپ کی طرف سے ہمیں یہ اجازت ہوتی کہ اگر یہ زبردستی قلعے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے!

معظم علی تھکال سا بھوک شاکت بیگ کے بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا: تم نے بہت بُرا کیا۔ اب میں مرشد آباد واپس جا کر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

شوکت بیگ نے آنکھیں کھولیں اور کہتے ہوئے کہا: آپ کے ساتھی بے قصور ہیں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی میں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن کا بیچھا کیا تھا۔

معظم علی نے پرامید ہو کر طبیب کی طرف دیکھا اور ملتی بچے میں کہا: آپ ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں!

طبیب نے جواب دیا: آپ اطمینان رکھیے میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔ شوکت بیگ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔



شام تک شوکت بیگ پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد معظم علی انتہائی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں قلعے کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ وہ قصور میں کسی

مرزا حسین بیگ اور کبھی فرحت اور اس کی والدہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے پوچھ رہے تھے: تم نے شوکت کو تنہا کیوں چھوڑ دیا؟ تم نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ جب ڈھاکہ

کی فوج واپس آرہی تھی تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ وہ مذمت کے قافلاً بل برداشت بوجھ تلے پسا جا رہا تھا اور اس کی زبان سے بار بار اس قسم کی دعائیں نکل رہی

تھیں: میرے مولیٰ! اگر تیری بارگاہ میں میری کوئی دعا قبول ہو سکتی ہے تو میں تجھے شوکت کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ میرے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ میں مرتے دم تک فرحت کا

خیال اپنے دل میں نہیں لاؤں گا۔ تو جانتا ہے کہ میں خلوص دل سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ زندہ رہے اس میں تمام وہ خوبیاں ہیں جو فرحت کے رفیق حیات میں ہونی چاہئیں، وہ فرحت کو خوش

رکھ سکتا ہے اور فرحت کی خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی تناس ہے۔

طبیب شوکت کے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر کہا: وہ اب ہوش میں ہے اور آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔

معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شوکت بیگ کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اسے شوکت بیگ کا چہرہ بے حد ندرت نظر آتا

تھا۔ اس نے منہم لہجے میں کہا: شوکت اب کیا حال ہے؟ شوکت نے ایک منہم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا: میرے

دوست آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے انوس ہے کہ میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

شوکت بیگ! مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہارا زندہ رہنا ضرور ہے۔



”شوکت نے کہا: آپ مجھے ہمیشہ خطرے کے سامنے جانے سے روکنے کی کوشش کیا کرتے تھے، مجھے اس بات سے چڑ ہو گئی تھی۔ میں بچپن سے بے حد ضدی ہوں۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ آپ شاید مجھے بزدل سمجھتے ہیں۔“

”نہیں شوکت! مجھے صرف اس بات کا ڈر تھا کہ تمہاری جرات میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔“

شوکت نے کہا: یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ ہائی آدمیوں کے مقابلے میں بڑی جان اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں؟

”معظم علی نے جواب دیا: اگر تم باقاعدہ فوج کے سپاہی ہوتے تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن تم ایک رضاکار کی حیثیت میں آئے تھے اور میں چاہتا تھا کہ صحیح سلامت اپنے گھر واپس جاؤ۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے اور ایک ایسے خاندان کی طرف سے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ اب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم تندرست ہو کر اپنے گھر پہنچ جاؤ اور خدا مجھے مرزا حسین بیگ کے سامنے شرمسار نہ کرے۔“

شوکت بیگ نے کہا: ”میں شاید گھر واپس نہ جاسکوں۔ لیکن آپ جب مرزا حسین بیگ سے ملیں تو ان سے یہ ضرور کہیں کہ میری موت ایک سپاہی کی موت تھی۔ میں اس بات کا اثر نہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے سپاہی بننے کا شوق کبھی نہ تھا اور یہ شوق صرف تمہاری وجہ سے پیدا ہوا۔ میں بچپن میں ہی اپنے والدین سے سنا کرتا تھا کہ میری مگنی مرشد آباد کے ایک معزز خاندان کی روکی کے ساتھ ہوگی۔ اس کے بعد بڑا ہو کر میں نے یہ سنا کہ ایک عزیز خاندان کے لڑکے نے اپنی جان پر کھیل کر مرزا حسین بیگ کے گھر کی حفاظت کی ہے اور شاید وہ اس کے ساتھ اپنی روکی کا رشتہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ پھر تمہاری قید کے زمانے میں مرزا صاحب ہمارے ہاں آئے تو وہ بات بات پر تمہارا ذکر کرتے تھے اور مجھے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس زمانے میں ہر نوجوان کے لیے سپاہی بننا نہ دینی ہے اور میں تمہیں دیکھنے بغیر ہی تمہارے متعلق اپنے دل میں ایک رقابت کا جذبہ محسوس کرتا تھا۔“

ایک دن میرے ابا جان نے مرزا حسین بیگ کے سامنے میری تعریف کی تو انہوں نے کہا: ”بنگلہ میں صرف ایک نوجوان پیدا ہوا تھا اور اس کا نام معظم علی تھا۔ پھر ہماری مگنی ہو گئی اور اس کے چند ہی ہفتے بعد تم واپس آ گئے۔“

میری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ لیکن جب ڈھاکہ کی فوج اڑیسہ کی طرف کوچ کی تیاری کر رہی تھی تو میرے ابا جان کو حسین بیگ کا خط ملا جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ افضل محاذ پر جا رہا ہے۔ سرہٹے ہماری قوم کے ہر نوجوان کو اڑیسہ کے میدانوں میں لگا رہا ہے میں اس لیے میری خواہش ہے کہ جنگ کے اختتام اور افضل بیگ کی واپسی تک شادی ملتوی کر دی جائے۔ انہوں نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے جن دوستوں کا شادی کے موقع پر ہونا ضروری ہے وہ سب محاذ پر جا چکے ہیں۔ میں اسی وقت سیدھا میر ملک کے پاس پہنچاؤں انہیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب تم سمجھ گئے ہو کہ میرے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی۔ میں مرزا حسین بیگ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں بنگال کے کسی نوجوان سے کم نہیں ہوں۔ میری یہ خواہش تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر میں کسی اور کی بجائے صرف میرے بہادر راز کار ناموں کا ذکر ہو۔ میں ہر میدان میں تم سے چند قدم آگے رہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ میں کوشش کے باوجود ان لوگوں کی صف میں کھڑا نہ ہو سکا جنہیں لڑائی کے بعد داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ تم ہر میدان میں مجھ سے آگے تھے اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں۔ اس وقت اگر مجھے کسی بات کا انفس ہے تو وہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک بہترین دوست اور ساتھی کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ مرزا حسین بیگ درست کہتے تھے کہ بنگال نے صرف ایک نوجوان پیدا کیا اور وہ معظم علی ہے۔ معظم علی نے کہا: ”بنگلہ کے ہزاروں نوجوان مجھ سے بہتر ہیں اور تم ان میں سے ایک ہو۔“ شوکت بیگ نے کہا: ”معظم علی مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ہم ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے لیکن میری منزل اب قریب آ چکی ہے۔ اس وقت

گھر مرزا حسین بیگ یہاں موجود ہوتے تو میں ان سے یہ کہتا کہ میں نے معظم علی بننے کی کوشش کی تھی اور میری حماقت تھی۔

انسان اپنی زندگی میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ایک دن وہ تھا جب تمہارا نام میرے نزدیک ایک گالی تھا۔ معظم علی برا نہ مانا۔ اب مجھے یہ باتیں کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات سے چڑھتی کہ تم مرزا حسین بیگ کے پڑوس میں رہتے ہو اور محلک ہر آدمی تمہاری تعریفیں کرتا ہے۔ میں نے آج تک فرحت کو نہیں دیکھا لیکن جو کچھ اس کے متعلق میں نے اپنی ماں اور بہنوں سے سنا تھا وہ میرے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا کہ ایسی ملکی کا شریک حیات بننا زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ مجھے یہ بات گوارا نہ تھی، کہ وہ کسی ایسے آدمی کو جانتی جو مجھ سے بہتر اوصاف کا مالک ہو۔ فرحت کے رشتے سے مرزا حسین بیگ کا انکار میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی اور میرے لیے اس شکست کا سب سے زیادہ ناقابل برداشت پہلو یہ تھا کہ میرے مقابلے میں ایک غریب ملازمان کے لڑکے کو ترجیح دی گئی ہے۔ اپنے والدین کی باتوں سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ فرحت کے والدین تمہاری طرف مائل ہیں۔ پھر جب تم لاپتہ ہو گئے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرے راستے سے ایک پہاڑ ٹھٹ گیا ہے۔ لیکن فرحت کے ساتھ منگنی ہو جانے کے بعد بھی میری خوش آرزو تھی۔ مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے معظم علی نہیں بن سکتا گا۔ پھر عہداری شادی کی تاریخ طوی کرنے کے متعلق مرزا صاحب نے جو خط لکھا اسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے بے حسی، بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دیا جا رہا ہے جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے عزام یہ تھے کہ میں کسی دن فتوحات کے پرچم بہراتا ہوا واپس آؤں گا۔ اور فخرت، عزت اور ناموری کے سیکڑوں تاج فرحت کے قدموں پر ڈھیر کر دوں گا۔ تم میری حماقتوں پر منہو گے۔

معظم علی نے کہا:۔ نہیں شوکت! میں جانتا کہ تمہارے سینے میں ایک بنایت حسین

دل ہے۔ لیکن کاش اس سے پہلے میں تمہیں یہ بتا سکتا کہ میں جس فرحت کو جانتا ہوں، وہ ان لڑکیوں سے مختلف ہے جو اپنے رینق حیات کا دوسرے انسانوں سے موازنہ کرتی ہیں۔

شوکت بیگ نے کہا: تم اسے جانتے ہو اور تم اس سے محبت کرتے ہو؟

معظم علی کا سارا جسم کپکپا اٹھا اور اس نے کہا: شوکت خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ تمہارے لیے ہے اور میں اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں تندرست ہوتے ہی گھر بھیج دوں گا۔

شوکت بیگ نے کہا:۔ میرے دوست ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب گھر واپس نہیں جاؤں گا۔ میں نے یہ باتیں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں، صرف اس لیے کہ میں کہتا ہوں کہ میرے دل پر یہ ایک بوجھ تھا کہ میں ایک ایسے آدمی کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور رقابت کے جذبات رکھتا تھا جس کے ساتھ مجھے محبت کرنی چاہیے تھی۔ معظم علی! تم انسان نہیں ایک فرشتہ ہو۔ کاش اس وقت افضل کی بہن یہاں موجود ہوتی اور اسے میں یہ کہہ سکتا کہ میں تمہارا مستقبل ایک بہتر انسان کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ شوکت بیگ نے یہ کہہ کر معظم علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ معظم علی کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے اور شوکت بیگ کے ہونٹوں پر ایک سکرامنٹ کھیل رہی تھی۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھ پر شوکت بیگ کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ معظم علی نے طبیب کو آواز دی طبیب نے اگر شوکت بیگ کی نبض دیکھی اور اس نے منہم لہجے میں کہا:۔ ان کا وقت آچکا ہے۔

اس کے بعد وہ دیر تک جانکنی کی حالت میں پڑا رہا اور رات کے پچھلے پہر جب قلعے سے باہر کسی درخت پر کوئل کی آواز صبح کی آمد کا پیغام دے رہی تھی۔ شوکت بیگ اپنا سفر حیات ختم کر چکا تھا۔



طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد شوکت بیگ کو سپردِ خاک کیا جا چکا تھا اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ معظم علی نے شوکت بیگ کے والد اور مرزا حسین بیگ کے نام خطوط لکھ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

اگلے دن معظم علی، علی الصباح ایک ہزار سوار لے کر مرہٹوں کے قلعہ میں روانہ ہوا اور چند مہینے سرحد کے جنگلوں اور پہاڑوں میں الٹا پیچھا کرتا رہا۔ جب وہ اس ہم سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو قیدی تھے۔ اس کے بعد قریباً ڈیڑھ سال وہ سرحد کے اہم مقامات پر دفاعی چوکیاں تعمیر کرنے اور مرہٹوں کے ستائے ہوئے لوگوں کی دیرانہ سیڑیوں کو دوبارہ آباد کرنے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے میرمدن کے نام درخواست لکھ کر ایک ماہ کی رخصت لی اور مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

مرشد آباد پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ علی دردی خاں بستر مرگ پر ہے اور سراج الدولہ نے میرمدن اور سلطنت کے چند اور بڑے عہدیداروں کو مرشد آباد بلا لیا ہے۔ مرزا حسین بیگ کے متعلق اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ چند ہفتے قبل ایک جہاز پر حج اور مقامات مقدسہ کی زیارات کی نیت سے روانہ ہو چکے ہیں۔

معظم علی نے گھر میں اپنی چھٹی کے پانچ دن گزارے تھے کہ علی دردی خاں راہی ملک آئے ہوا اور مرشد آباد کے باشندے یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنگال کا وہ دفاعی حصار ٹوٹ چکا ہے جسے وہ اپنی آزادی اور بقا کی سب سے بڑی ضمانت سمجھتے تھے۔ مرشد آباد کی مساجد میں علی دردی خاں کے لیے مغفرت اور بنگال کے نئے حکمران سراج الدولہ کے لیے کامیابی اور کامرانی کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

علی دردی خاں کی وفات کے تین دن بعد معظم علی نے میرمدن سے، جسے ڈھاکہ سے بلا کر بنگال کی فوج کی سپہ سالاری سپرد کی گئی تھی، ملاقات کی اور اس کے بعد گھر واپس آکر اپنی

ماں سے کہا: امی جان! میری رخصت منسوخ کر دی گئی ہے اور میں کل صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

ماں نے معنوم بچے میں کہا: میرا خیال تھا کہ سراج الدولہ اور میرمدن تمہیں مرشد آباد میں کوئی عہدہ دے دیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا: امی جان! میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ میں نے میرمدن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھائی یوسف کو ڈھاکہ سے یہاں بلا لیں اور انھوں نے میری یہ بات مان لی ہے۔

ماں نے کہا: بیٹا! میں ایک عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ مرزا حسین بیگ کے گھر جا کر تمہارے رشتے کے متعلق کچھ کہوں۔ ابھی فرحت کی ماں مجھ سے مل کر گئی ہے اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ راج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے مرزا صاحب فرحت کے رشتے کے متعلق ہمارے طرف سے سلسلہ جھبانی کے منتظر تھے۔ میں نے کہا: بہن میں تو ہر روز معظم کے ابا کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا کرتی تھی، لیکن انھیں حوصلہ نہیں ہوا۔ اب اگر آپ تیار ہیں تو میں ابھی محلے میں مٹھائی تقسیم کرواتی ہوں۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ ہمیں حج سے مرزا صاحب کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔

معظم علی نے جھجکے اور شرماتے ہوئے کہا: امی جان! فرحت کیسی ہے؟

ماں نے جواب دیا: فرحت چند ہفتوں سے کچھ بیمار تھی۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہے۔ چند دن بعد معظم علی سرحدی قلعے میں پہنچ چکا تھا۔

علی دردی خاں کے آنکھیں بند کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ انگریزوں کی تجارتی کونٹینیاں قلعوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل ہونے لگیں اور وہ حریص قسمت آزما جو قوم کی عزت اور آزادی کو مال تجارت سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے

ساتھ ساز باز کرنے لگے۔ سراج الدولہ کو انگریزوں کے عزائم کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی اور اس نے مندرجہ حکومت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف توجہ کی۔ انگریز تاجر حکومت بنگال کے ساتھ اپنے سابقہ معاہدوں کو بالائے طاق رکھ کر قلعہ بندیوں میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ مصالحت کی گفتگو بے نتیجہ ثابت ہو چکی تھی اور سراج الدولہ کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ بنگال کی حکومت کے نئے دعویداروں کو صرف ایک فوجی شکست ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک دن فرٹ ولیم کے سفید فام محافظ شیر بنگال کی گرج سن رہے تھے۔

معظم علی چند ماہ سے مغربی سرحد پر اپنا مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے انگریزوں کے متعلق سراج الدولہ کے عزائم کا علم ہوا تو اس نے میرمدن کو ایک خط لکھا کہ اب سرحدی علاقوں کو کوئی خطرہ نہیں، اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔

چند ہفتوں تک اس کی درخواست کا کوئی جواب نہ آیا اور وہ سخت بے چین رہا۔ پھر ایک دن اسے میدانِ لڑنے کے فوجدار کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے فرٹ ولیم پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے چار دن بعد اسے میرمدن کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہم انگریزوں کو ایک عبرتناک شکست دے چکے ہیں۔ لیکن تمہیں یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اس کامیابی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ انگریزوں کے خلاف ہم نے ایک لڑائی جیتی ہے لیکن بنگال کو ان کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے ہمیں شاید ایسی کئی اور جنگیں لڑنی پڑیں اور ان جنگوں سے ہم اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سرحدی علاقے مرہٹوں کے حملوں سے محفوظ ہوں۔ تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی ہے اور تم نے ہر مرحلے پر اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا ہے اس لیے میری یہ خواہش ہے کہ جب تک انگریزوں سے ہماری جنگ ختم نہیں ہوتی تم بنگال کے

مغربی دروازے پر پہرہ دیتے رہو اور میں تم جیسے سمجھدار نوجوان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑنے والے سپاہی کی نسبت خاموشی سے پہرہ دینے والے سپاہی کا کام بسا اوقات زیادہ صبر آدا ہوتا ہے۔

چند مہینے اور گزر گئے اور معظم علی کو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ سراج الدولہ انگریزوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مرزا حسین بیگ حج سے واپس آگئے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ تم چند دن کے لیے گھر آؤ۔ اس نے میدانپور کے فوجدار کو ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست بھیجی، لیکن اس نے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حالات میں تمہیں ایک دن کیلئے بھی چھٹی دینا ممکن نہیں۔ نواب سراج الدولہ نے مجھ سے پانچ ہزار سوار دو ہفتوں کے اندر اندر مرشد آباد بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے، انھوں نے اس کی وجہ بیان نہیں کی تاہم سپہ سالار کے خط سے میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ عنقریب انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ مدت اور انتظار کرو۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں تمہیں ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کی چھٹی دے دوں گا۔ فی الحال پانچ ہزار سواروں کی تعداد پوری کرنے کیلئے تمہارے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی اپنے تمام فالتو سپاہی سیدھے مرشد آباد روانہ کر دو اور اپنے پاس صرف اتنے آدمی رکھو جو قلعے اور سرحدی چوکیوں کی حفاظت کے لیے اشد ضروری ہوں۔

معظم علی نے یہ خط ملتے ہی پانچ سو سپاہی قلعے کی حفاظت اور تین سو اس پاس کی چھوٹی چھوٹی چوکیوں کی نگرانی کے لیے روک لیے اور باقی فوج کو اپنے ایک تجربہ کار افسر کی کمان میں دے کر مرشد آباد کی طرف کوچ کا حکم دیا۔



چند ہفتے معظم علی کو مرشد آباد کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی اور وہ سخت بے چین رہا۔



ایک دن اسے محمود علی کا خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: مجھے سراج الدولہ نے اپنے محافظ دستوں کا سالار اعلیٰ مقرر کر دیا ہے۔ یوسف اور افضل بھی محافظ فوج کے سالار بنا دیئے گئے ہیں۔ ہمیں آٹھ پہر کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم ملا ہے اور انشاء اللہ مغربیہ تم یہ سنو گے کہ ہم بنگال کو الیٹ انڈیا کمپنی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا چکے ہیں۔ اس کے بعد چند دن اور گزر گئے اور معظم علی کو جنگ کے حالات کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔

ایک روز رات کے تیسرے پہر معظم علی قلعے کے اندر اپنی قیام گاہ کی چھت پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک پہریلا نے اسے جگایا اور یہ اطلاع دی کہ مرہٹوں نے سرحد ایک چوکی پر اچانک حملہ کر کے تیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ معظم علی جلدی سے نیچے اترا۔ چند سپاہی جو سرحد کی چوکی سے بھاگ کر آئے تھے قلعے کے صحن میں کھڑے تھے۔ معظم علی ان سے حملے کی تفصیلات پوچھ رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایک پہریلا بھاگا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ دروازے کے باہر ایک آدمی کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہماری چوکی پر بھی مرہٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ معظم علی نے تین سو سواروں کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور پھر پہریلا کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اگر تم اسے پہچانتے ہو تو اسے اندر آنے دو۔"

"جی میں اسے پہچانتا ہوں۔" پہریلا یہ کہہ کر اسی طرح بھاگا ہوا واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک آدمی لشکر لٹا ہوا قلعے کے صحن میں داخل ہوا۔ معظم علی نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا: "تم زخمی ہو؟" جی میں قلعے سے ایک میل دور گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ "تم کس چوکی سے آئے ہو؟" معظم علی نے سوال کیا۔ "جی میں شمال کی تیسری چوکی سے آیا ہوں۔ مرہٹوں نے ہم پر بے خبری کی حالت

میں حملہ کر کے ہمارے بیشتر آدمی قتل کر دیئے۔ میرے باقی ساتھی ادھر ادھر بھاگ گئے تھے مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔"

معظم علی نے ایک عمر رسیدہ افسر کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "عبدالرحمن! معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے بڑے پیلے پر پیشقدمی شروع کر دی ہے۔ مجھے شاید اس ہم میں چند دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں قلعے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہوگی۔ تم اسی وقت تمام چوکیوں کے سپاہیوں کو یہ حکم بھیج دو کہ وہ قلعے میں جمع ہو جائیں۔ اگر مرہٹوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ ہمیں باہر سے کسی فوری کمک کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اگر مرہٹے آگے بڑھ آتے تو یہ قلعہ ہمارا آخری سہارا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی تین سو سواروں کے ہمراہ قلعے سے باہر نکل گیا۔

سرحدی علاقوں پر حملہ کرنے والے مرہٹوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی، وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے سرحدی علاقے کی محافظ فوج کی دفاعی طاقت کا اندازہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ علی الصباح قلعے سے چند میل دور مرہٹوں کے چند دستوں کے ساتھ معظم علی کے سپاہیوں کی جھڑپ ہوئی اور وہ معمولی مقابلہ کے بعد پندرہ بیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کے بعد اسے چند میل دور مرہٹوں کے ایک اور دستے کی اطلاع ملی اور اس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

مرہٹوں کے اچانک حملے سے خوفزدہ ہو کر سرحد کے لوگ اپنی بستیاں خالی کر رہے تھے لیکن معظم علی کی طرف سے بردت جوابی کارروائی کے باعث ان کے حوصلے بندھ گئے اور وہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ایک شام کوئی پچاس مرہٹے ایک بستی کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ معظم علی خبر ملتے ہی وہاں پہنچا اور اس نے تیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پیچھے سے بیشتر مرہٹے بستی کے چودھری کے پانچ میٹوں کے علاوہ دس اور آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ جن کا

جرم صرف یہ تھا کہ وہ مرہٹوں کے ہاتھوں چند لڑکیوں کی بے عزتی خاموشی سے برداشت نہ کر سکے۔

معظم علی نے رات بھر اس بستی میں قیام کیا۔ صبح ہوئی تو اس نے اس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: "چندوں اور ڈاکوؤں کے سامنے بیڑوں کی طرح بھاگنے والوں کو بچانا کسی فوج کا کام نہیں۔ فوج کی مدد صرف ان لوگوں کے لیے سودمند ہو سکتی ہے جو بہادری کی طرح جینا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم ان چوروں اور ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اپنی بستیوں میں رضا کاروں کی فوج تیار کرو۔ پھر وہ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تم جیسے خونخوار درندوں کے ساتھ جنی قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ میں تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔ جن کے جوان بیٹوں اور بھائیوں کی ردھیں انتقام کے لیے پکار رہی ہیں اور میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ تمہیں کسی انسانی سلوک ماستی نہ سمجھیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے دوسرے ساتھی اس طرف آئیں تو انہیں اس بستی کے باہر درخت کے ساتھ تمہاری لاشیں لٹکتی نظر آئیں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب معظم علی اس بستی سے رخصت ہوا تو مقامی لوگ گاؤں سے باہر تیس مرہٹوں کے گلوں میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکا چکے تھے۔

چند دن تک مختلف مقامات پر درختوں سے لٹکی ہوئی لاشیں اس بات کا ثبوت دیتی رہیں کہ سرحد کا محافظ ان علاقوں سے گزرا ہے۔

قریباً بیس دن کے اندر سرحدی علاقوں میں مکمل امن قائم کرنے کے بعد معظم علی واپس پینجاؤں اس نے قلعے میں داخل ہوتے ہی اپنے قائم مقام سے سوال کیا: "مرشد آباد یا میدناپور سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

جی نہیں! قائم مقام نے جواب دیا:



دو دن بعد میدناپور سے ایک فوجی افسر جس کا نام ہاشم خاں تھا، تیس سواروں کے ہمراہ معظم علی کے پاس پہنچا اور اس نے میدناپور کے فوجدار کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا: "تم خط ملتے ہی قلعے کی کمان ہاشم خاں کے حوالہ کر کے میدناپور پہنچ جاؤ۔ میں چند اہم معاملات کے متعلق تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں!"

معظم علی نے خط پڑھنے کے بعد ہاشم خاں سے سوال کیا: "مرشد آباد سے جنگ کے متعلق کوئی اطلاع ملی ہے؟"

ہاشم خاں نے جواب دیا: "جنگ کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن مرشد آباد سے ایک خاص ایچی میدناپور کے فوجدار کے پاس آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے لیکن اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد فوجدار نے مجھے اس طرف روانہ کر دیا اور میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ ایچی کیا خبر لایا تھا۔ فوجدار نے اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ آپ فوراً میدناپور پہنچ جائیں!"

معظم علی نے کہا: "اگر وہ تاکید نہ کرتے تو بھی میری طرف سے تاخیر نہ ہوتی۔ میں وہاں پہنچ کر مرشد آباد کے حالات معلوم کرنے کے لیے سخت بے چین ہوں۔"

قریباً آدھ گھنٹہ بعد معظم علی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو خطا فظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ چار نوجوان اس کے ساتھ تھے۔ وہ قلعے سے صرف چار کوس دور گیا تھا کہ اسے ایک سرسبز سوار اپنی طرف آنا دکھائی دیا۔ جب ان کے درمیان کوئی دوسو گز کا فاصلہ رہ گیا تو معظم علی کے ایک ساتھی نے کہا: "جناب وہ عبداللہ خاں معلوم ہوتا ہے۔"

معظم علی نے تھوڑی دور آگے جا کر گھوڑا روکا اور آنے والے سوار کو ہاتھ سے اشارہ کیا: "عبداللہ خاں نے قریب اگر کسی تہید کے بغیر سوال کیا: آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں میدناپور جا رہا ہوں۔" معظم علی نے جواب دیا: "تم گھر کے حالات سناؤ؟"

عبداللہ خاں معظم علی کی فوج کے پچاس سواروں کا سالار تھا۔ مرشد آباد میں اس کا



مگر بھی معظم علی کے پڑوس میں تھا۔ قریباً تین ماہ سے وہ رخصت پر تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے گھوڑے سے اتر پڑا اور گردن جھکا کر معظم علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کیا بات ہے عبداللہ؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

”کیا ہوا عبداللہ؟“ معظم علی نے مضطرب ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

عبداللہ خاں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”میں بہت بُری خبر لایا ہوں آپ

میدان پور کی بجائے سیدھے گھر جائیں۔ مرشد آباد لٹ چکا ہے!“

معظم علی گھوڑے سے کود پڑا اور عبداللہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے

چلتا ہوا خدا کے لیے جے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

عبداللہ خاں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کرتے ہوئے کہا: آپ کے ابا جان

اور یوسف شہید ہو چکے ہیں۔ افضل بھی شہید ہو چکا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو تمام

واقعات کی اطلاع مل چلی ہوگی۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں۔ میر جعفر نے بنگال کو انگریزوں

کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔“

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے باپ، اپنے بھائی اور افضل کی

موت کا یقین کر سکتا تھا۔ لیکن بنگال کی افواج کی شکست اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔

اس نے کرب انگیز آواز میں سوال کیا: ”سراج الدولہ کہاں ہیں؟ ہمیں شکست کیسے ہوئی؟“

”سراج الدولہ کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شکست کے بعد مرشد آباد

آگئے تھے اور پھر راتوں رات وہاں سے نکل گئے تھے۔“

یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کی شکست پر کبھی یقین

نہیں کر سکتا۔“

”ہمیں انگریزوں نے شکست نہیں دی۔ ہم اپنے غداروں کے ہاتھوں مارے

گئے ہیں۔ میر جعفر انگریزوں سے بنگال کی آزادی کا سودا کر چکا ہے۔ میر مدن شہید ہو چکے ہیں۔

میر جعفر نے فوج کے افسروں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس وقت ہماری فتح بالکل قریب تھی

وہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ میں جنگ میں شریک تھا اور غداری اور وطن فروشی کا منظر میں

نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارا تو پناہ خاموش تھا۔ ہمارے بیشتر سوار میدان سے

دور کھڑے تھے۔ سراج الدولہ کے مٹھی بھر جاں نثار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گرے تھے

اور ہم آخری وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ ہماری توہیں اچانک آگ برساہیں گی۔ ہمارے سوار

اچانک فیصلہ کن حملہ کریں گے اور ان کی آن میں دشمن کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن یہ کسے معلوم

تھا کہ ہم پلاسی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے جنگ ہار چکے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں

کے سامنے یوسف اور افضل کو گرگرم آؤڑتے دیکھا تھا اور آپ کے ابا جان جب انھوں سے

چوڑ ہو کر مرشد آباد پہنچے تھے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ سراج الدولہ انھیں مل میں اپنے ساتھ

لے گئے تھے۔ پھر رات کے وقت جب وہ مرشد آباد چھوڑ رہے تھے تو آپ کے ابا جان کو

گھر بچھا دیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت انھوں نے دم توڑ دیا تو محلے کے لوگوں نے مجھ

سے کہا کہ میں آپ کو اطلاع دوں۔“

معظم علی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: اب ہمیں میدان پور جانے کی

ضرورت نہیں۔ تم واپس قلعے میں چلے جاؤ۔ میری منزل مرشد آباد ہے۔ عبداللہ تھا اکیسا

ارادہ ہے؟“

”میں آپ کے ساتھ ہوں!“ اس نے جواب دیا۔

مرشد آباد کی طرف چند منازل طے کرنے کے بعد معظم علی نے یہ خبر سنی کہ سراج الدولہ

قتل ہو چکا ہے۔ میر جعفر نے لارڈ کلاؤ کی سرپرستی میں بنگال کی حکومت سنبھال لی ہے اور

مرشد آباد میں سراج الدولہ کے وفادار ساتھیوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔“